O

سنہرا پیالہ

تصنیف

محمد میر کیانی

مترجم

پروفیسر ذاکرہ شریف قاسمی

اسلامی کتاب گھر، دہلی و تکا توسعۂ کتاب ایران

سنہرا پیالہ

(ایرانی کہانیوں کا اردو ترجمہ)

نام کتاب : سنہرا پیالہ (جام طلایی)

تصنیف : محمد میر کیانی

مترجم : پروفیسر ذاکرہ شریف قاسمی

ایڈیٹر : پروفیسر شریف حسین قاسمی

ناشر : اسلامی کتاب گھر، دہلی و تکاتو سعۂ کتاب ایران

سن اشاعت : ۱۴۳۱ھ/ ۱۳۸۹ھ ش/ ۲۰۱۰ عیسوی

کمپوزنگ : جی این گرافکس، ٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

صفحہ آرائی : علی رضا

ٹائٹل : حارث منصور

مطبع : الفا آرٹ، نوئیڈا (یو. پی.)

فہرست

- عرض حال ۷
- سونے کا انڈا ۱۳
- جڑاؤ تلوار ۲۶
- سونے کا جام ۴۰
- کیمیاگر ۵۳
- دو بھائیوں کا سفر ۶۵
- یاقوت کی تھیلی ۷۷
- دولومڑیاں ۹۰
- بوڑھا پہلوان ۱۰۳
- سمجھدار لڑکی ۱۱۷
- دو مسافر ۱۳۰
- سنہرا پیالہ ۱۴۴
- حاتم اور لکڑہارا ۱۵۵
- شیر اور بلی ۱۶۷

پروفیسر ذاکرہ شریف قاسمی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں فارسی کی استاد ہیں۔ دہلی کی رہنے والی ہیں اور اسی تاریخی اور قدیم شہر میں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ دہلی کالج (آج کے ذاکر حسین کالج) دہلی یونیورسٹی سے آپ نے فارسی میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں اول رہیں۔ اسی کالج سے فارسی میں ایم۔اے کیا اور دہلی یونیورسٹی ہی سے آپ نے بی۔لب اور پھر Ph. D. کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ کی Ph. D. مقالے کا عنوان تھا ''فارسی ادب بہ عہد شاہجہان'' آپ ۱۹۷۷ء سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں فارسی کی استاد ہیں اور سینیر استاد۔ کئی طلبا آپ کی رہنمائی میں ایم فل اور ڈاکٹریٹ بھی کر چکے ہیں۔ اس سے قبل آپ ''فارسی شاعری: ایک مطالعہ'' اور ایک ایرانی سفرنامہ ''زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار'' شائع کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے متعدد مقالات و قیع رسائل اور دانشنامۂ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے ہندستان اور ایران میں چند علمی و ادبی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور مقالات پیش کئے ہیں۔

عرض حال

آپ اس مجموعے میں محمد میرکیانی کی چند کہانیاں پڑھیں گے۔ یہ بیشتر بچوں اور جوانوں کے لیے لکھتے ہیں اور آج کے ایران میں ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

محمد میر کیانی ۱۳۳۷ء میں ایران کے پایتخت تہران میں پیدا ہوئے۔ یہ تقریباً تین دہائیوں سے بچوں اور جوانوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اسی نوعیت کی ان کی ساٹھ سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ مختلف کتابوں میں شائع ہونے والی ان کی مختصر داستانوں کی تعداد تقریباً پانچ سو تک پہنچتی ہے۔

میرکیانی کی داستانیں ایران میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ ۹۰ میں ان کی ایک کتاب کو سال کی سب سے اچھی کتاب قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایران میں دیگر مراسم کے موقع پر بھی ان کی تخلیقات کو انعامات سے نوازا گیا ہے۔

یہ انجمن نویسندگان کودک ونوجوان کے ایک منتخب لکھنے والوں میں بھی شمار ہوتے ہیں۔

پانچ جلدوں میں ان کی ایک کتاب ''قصۂ ماہمین بود'' کا ۷۳ میں اردو میں

ترجمہ کیا گیا جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ جرمنی کے بین الاقوامی مرکز نے بھی ان کی دو کتابوں ''پاپر'' اور ''روزی بود و روزی نبود'' کو اپنی مناسب کتابوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

اسی طرح میر کیانی کے متعدد قصے کہانیاں بچوں اور جوانوں کے لیے مخصوص رسایل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی چند تصنیفات بزرگوں کے لیے بھی شائع ہو چکی ہیں۔

محمد میر کیانی اپنے فرائض منصبی میں مشغول رہنے کے باوجود، بچوں اور نوجوانوں کے لیے لکھنے کو نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ درج ذیل اداروں اور انجمنوں سے وابستہ بھی ہیں:

(۱) سیکریٹری انتشارات کانون پرورش فکری کودکان و نوجوانان

(۲) چیف سیکریٹری قصۂ ظہر جمعہ، ریڈیو، ایران

(۳) ''سورۂ نوجوان'' رسالے کے چیف ایڈیٹر

(۴) ''از سر زمین نور'' اور ''گفتہ ہا و نا گفتہ ہا'' پروگراموں کے سرپرست

(۵) ''مرکز فرہنگی صبا'' کے پروگراموں کی ترتیب دینے والی کمیٹی کے ممبر

(۶) شورای فرہنگی بنیاد فارابی کے ممبر

(۷) شورای سامان دھی پویانمایی کے ممبر

(۸) کتب درسی آموزش و پرورش کے مولفین کی جماعت کے ممبر

(۹) فی الحال یہ گروہ کودک و نوجوان، سیما، چینل ایک کے سیکریٹری ہیں۔

میر کیانی نے اب تک پچیس کتابیں قدیم و عامیانہ ادب کے متعلق بھی لکھی ہیں۔ یہ بیشتر بچوں اور نوجوانوں کے لیے ہیں۔ اس مخصوص میدان میں ان کی آخری نگارش عامیانہ ادب سے متعلق ان کی ایک تحقیقی کتاب ''راز مثل ہای ما'' ہے۔

میر کیانی نے ایک مدت تک، بچوں کے ادب اور قصہ گوئی، کی تعلیم بھی دی ہے۔

میر کیانی کے جن قصوں کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، وہ ان کی کتاب ''قصہ ہای شب چلّہ'' سے ماخوذ ہیں۔اس میں کل بیس قصے شامل ہیں۔

میر کیانی قصہ لکھنے کی ٹکنیک سے خوب واقف ہیں۔وہ اپنے مخاطبین کی عمر، ان کی دلچسپیاں، ان کے ذہنی معیار، اور قصے میں ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے ہنر سے نہ صرف خوب آشنا ہیں، بلکہ اسے بہ حسن وخوبی عملی جامہ پہنانا بھی جانتے ہیں۔ وہ بچوں اور جوانوں کے لیے لکھ رہے ہیں، اس لیے ان کی زبان اور انداز بیان بھی انہی کی سطح کا ہے۔ ہر قسم کی پیچیدگی سے محفوظ، وہ بامحاورہ زبان لکھتے ہیں، قصے کے کرداروں کی زبان جانتے ہیں، لیکن اس انداز سے لکھتے ہیں کہ ان کے پڑھنے والے (بچے اور جوان) انہیں اور نفس مطلب کو بہ آسانی سمجھ سکیں، ان سے لطف اندوز ہوسکیں۔

ایران، ہندوستان کی طرح قصے کہانیوں کا ملک ہے۔ یہ قصے اور کہانیاں ہمارے سماجی رویوں کے غماز اور ترجمان ہوتے ہیں۔ہم ان سے اپنے سماج کی اچھائیوں سے بھی واقف ہوتے ہیں اور اس کی برائیاں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔میر کیانی کے تمام ہی قصوں نے کوئی نہ کوئی سبق دیا ہے، نصیحت کی ہے۔ یہ قصے کتنے ہی پرانے زمانے سے متعلق ہوں، لیکن ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ سماج میں آج بھی ایسے نقائص اور تجاوز کاریاں نظر آتی ہیں جن کی بیخ کنی کی ان قدیم قصوں کے ذریعے کوشش کی جارہی ہے۔میر کیانی ایرانی ہیں، ایران اور ایرانی سماج کو خوب جانتے ہیں۔وہ قدیم ایران سے بھی واقف ہے اور آج کے ایران میں تو سانس لیتے ہیں۔اسی وجہ سے انہوں نے اپنے قدیم ادب سے ایسے قصوں کا انتخاب کیا ہے، اور کچھ قصے خود بھی تخلیق کیے ہیں، جن کی مدد سے

وہ آج کے ایرانی سماج کی تصویرکشی میں کامیاب ہیں۔ اسی طرح سماجی اصلاحات کی جوکوشش انہوں نے اپنے ان قصوں کے ذریعے کی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔

اگرغور کیاجائے تو پتا چلے گا کہ میرکیانی کے ان قصوں سے ملتے جلتے قصے اسی نوعیت کے خود ہمارے ادب میں بھی موجود ہیں۔

یہاں خاص طور پر پنج تنتر کا ذکر کرنا ہوگا۔ فارسی ادب پر ہماری کہانیوں کے اس مجموعے نے دیرپا اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ قصے، کہانیوں کی کتابوں کو چھوڑیے کہ یہاں کسی نہ کسی طور سے پنج تنتر کا پرتو محسوس ہوتا ہی ہے، ایرانی شعرا، دانشمندوں اور یہاں تک کہ عظیم سیاسی اشخاص نے بھی پنج تنتر کے مطالب سے اپنے اپنے مقاصد کی برآری کے لیے فائدہ اٹھایا ہے۔مولانا روم نے اپنی عظیم مثنوی میں پنج تنتر کی کہانیاں دہرائی ہیں، نظام الملک طوسی نے اپنے "سیاست نامہ" میں پنج تنتر کی داستانوں سے اپنے مقصد کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔میرکیانی کی داستانوں پر بھی پنج تنتر کے قصوں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔خاص طور پر ان کہانیوں پر جن کے کیرکٹر پنج تنتر کی طرح چرند وپرند ہیں۔ فارسی میں ہم جب بھی اس نوعیت کی کہانیاں پڑھتے ہیں تو ہند وایران کے قدیم رشتوں خاص طور پر علمی، ادبی اور سماجی تعلقات کی ایک وسیع دنیا ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ اتنے گہرے اور بامعنی تھے کہ ان کی گونج آج بھی ایرانی ادب میں سنائی دیتی ہے۔

میرکیانی کے قصوں میں جو کردار، ان کے جواخلاق، سماج کی برائیاں یا اچھائیاں پیش کی گئی ہیں، ان کی تلاش ہمارے سماج میں بھی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ یہ شاید مشرق کا خاصہ ہیں اوراسی طرح ایرانی وہندوستانی سماج کے مشترک پہلوؤں کے جلوے اور مناظر۔ مصنف نے اپنی اس کتاب کے شروع میں

''شبہای چلّہ، شبہای قصہ، کے عنوان سے ایک مختصر یادداشت میں لکھا ہے:

''اللہ بخشے پرانے زمانے کے لوگوں کو، وہ اکٹھا بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ہمدلی اور ہمزبانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ سال کی سب سے طویل رات یعنی ''شب چلّہ'' یا ''شب یلدا'' (سال کی سب سے طویل اور تاریک رات) تھی جو انہیں بیٹھنے کا بہتر موقع فراہم کرتی تھی۔

ایران میں عام رواج تھا کہ شدید سردی کے دنوں میں کمرے کے بیچ میں ایک اسٹول رکھ دیا جاتا، اس کے نیچے آگ کا برتن ہوتا۔ اسٹول پر ایک بڑا سا لحاف ڈال دیا جاتا تھا۔ لحاف کے نیچے چاروں طرف گھر والے بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے۔ اس طرح سردی سے محفوظ رہتے تھے۔ اسی کو کرسی کہتے تھے۔ یہ طریقہ آج بھی ایران کے گاؤں میں رائج ہے۔

چلّے کی رات کو چھوٹے بڑے سب کرسی کے گرد بیٹھ جاتے، تربوز اور خربوزے کی قاشیں کی جاتیں، خشک میوہ اور مٹھائی کھائی جاتی والد اور ماں قصے سناتے اور سب اس میں گم ہو جاتے۔ اس کتاب میں ایسے ہی قصے بیان کیے گئے ہیں۔''

راقم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ترجمہ آسان زبان میں کیا جائے۔ جہاں مصنف نے کوئی فارسی محاورہ استعمال کیا ہے، اگر ممکن ہو سکا ہے، اس کا اردو معادل ترجمے میں آپ کو نظر آئے گا۔ یہ کوشش بھی رہی ہے کہ ترجمہ اصل زبان سے جس قدر ہو سکے قریب رہے۔ اس وجہ سے کہیں کہیں یہ احساس ہوگا کہ یہ فارسی سے اردو ترجمہ ہے۔ میری نظر میں یہ کوئی عیب نہیں۔ ہم اس طرح لفظی ترجموں سے اگر وہ ثقیل اور دوراز فہم نہیں، اپنی اردو زبان کو نئی تراکیب نئے محاوروں اور نئے الفاظ سے مالا مال کرتے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔

امید ہے کہ میر کیانی کے چند فارسی قصوں کا یہ اردو ترجمہ اردو قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میں جناب ڈاکٹر علی رضا قزوہ، مدیر مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ انہی کی تجویز پر یہ کام انجام دیا گیا ہے اور پھر آپ کے ہاتھوں تک پہنچا ہے۔ یہ سب ڈاکٹر قزوہ صاحب کی علم و ادب دوستی کا ثبوت ہے۔

پروفیسر ذاکرہ شریف قاسمی
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

سونے کا انڈا

برسوں پہلے کہیں دوردراز علاقے میں ایک شخص رہتا تھا۔جھاڑ جھنکار جمع کرنا اور لکڑیاں توڑنا اس کا کام تھا، یہی اس کی روزی روٹی کا ذریعہ تھا ۔یہ ہر روز صبح کلہاڑا کندھے پر رکھتا اور جہاں کہیں کسی گھر کے قریب کوئی سوکھا درخت دیکھتا، اس کو جڑ سے کاٹ دیتا، اپنے کلہاڑے سے اس کو توڑتا، بازار لے جاتا اور فروخت کردیتا، یہ لکڑھارا آرام اور سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔ایک دن کا کرنا ایسا ہوا کہ جب وہ حسب معمول کام میں مصروف تھا تو اپنے کلہاڑے کی ایک ہی جیسی آواز کے درمیان جو سوکھے درخت پر پڑنے سے پیدا ہوتی تھی، اس نے ایک دوسری آواز سنی: اے مہربان انسان! یہاں آ اور میری مدد کر، اطمینان رکھ، اس کام کا اچھا معاوضہ ملے گا۔

لکڑھارے نے یہ آواز سن کر کام سے ہاتھ روک لیا۔اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور ایک عجیب چیز دیکھی، رنگ برنگ کے پروں والا پرندہ جسے دیکھ کر ہر انسان مات ومبہوت ہوجائے، زخمی پروں کے ساتھ زمین پر پڑا ہوا ہے۔

لکڑھارے نے اس پرندے کو زمین سے اٹھالیا اور کہا: اب بتاؤ کیا کروں؟ کیا اپنا کام روک دوں اور تیرا علاج معالجہ کروں؟ تو پھر آج کی میری روزی

روئی کا کیا ہوگا؟

خوبصورت پروں کے پرندے نے جواب بے حال ہو چکا تھا، اور اس میں بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی، کہا: مجھے ابھی اسی وقت لے چل میرا علاج کرو اور اپنی آج کی روزی روٹی کی پروا نہ کرو، میرے لیے جو کام تو انجام دے گا، میں اس کی ایسی اجرت تجھے دوں گا جو تو نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔

لکڑھارے کو تجسس ہوا، اس نے دریافت کیا: اچھا، تو مجھے کیا دے گا؟

پرندے نے جواب دیا: اگر تو ابھی اسی وقت مجھے اپنے گھر لے چلے اور میرا علاج کرے تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تین دن تک ہر روز ایک سونے کا انڈا دوں گا۔ اب تو خود ہی سوچ کہ سونے کے ان انڈوں سے ایسا کون سا کام ہے جو تو نہیں کر سکتا، کیا چیز خرید نہیں سکتا اور کونسی ایسی آرزوئیں ہیں جو پوری نہیں کر سکتا۔

لکڑھارے نے جب اس زخمی پرندے سے یہ سب باتیں سنیں تو اس نے فوراً اپنا کلہاڑا ایک طرف ڈالا، تاکہ اطمینان کا سانس لے سکے اور جلدی سے گھر پہنچ سکے، اس نے اپنا خچر بھی وہیں چھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے اس کا حال دیکھا اور پوچھا: ارے کیا ہو گیا! یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ تیرا خچر اور وہ لکڑیاں کہاں ہیں جو آج توڑی ہوں گی۔ یہ پرندہ کیوں پکڑا ہے۔ کیا یہ کوئی خزانہ ہے جو اسے دل پر بٹھا رکھا ہے؟

لکڑہارا خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے کہا: ہاں ایک خزانہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ بس کچھ دن زبان بند رکھ اور کچھ کہہ سن نہ کر، پھر تیری سمجھ میں

آئے گا کہ میرے ہاتھ کیا خزانہ لگا ہے۔

لکڑہارے نے یہ بات کہی اور طلائی پرندے کا علاج کرنے اور اسے دانا پانی دینے میں مشغول ہوگیا۔ پرندے نے دو تین دن اسی طرح گذار دیے۔ اس کی حالت ٹھیک ہوگئی لکڑھارے کے باغیچے میں اڑان بھری، دانہ کھایا اور موٹا تازہ ہوگیا۔ اسی دن طاق میں اس نے انڈا دیا۔

لکڑہارے نے اس خوش بختی اور اقبال کو دیکھا جو اسے نصیب ہوگیا تھا، اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دی اور سونے کا انڈا دکھایا۔

عورت نے جو سونے کا انڈا دیکھا تو بہت خوش ہوئی، لیکن کچھ شک و شبہ اس کے دل میں پیدا ہوگیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے اگر سونے کے اس انڈے کو اب بھاری رقم میں کسی نے خرید بھی لیا، تو اچھا ہے۔ شاید کہیں ایسا نہ ہو جیسا تو نے خیال کیا تھا۔

لکڑہارے نے اب انڈا اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا: خیال کیا؟ میں نے یہ باتیں خود پرندے کی زبان سے سنیں ہیں۔ تو بھی یقین کرلے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ابھی جاتا ہوں اور اس انڈے کو بیچ دیتا ہوں۔

لکڑہارے نے یہ بات کہی اور خوشی خوشی بازار چلا گیا۔

جب وہاں پہنچا تو سونے کا انڈا ایک جوہری کو دکھایا اور اس سے کہا کہ میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔ جوہری نے سونے کے انڈے کو کسوٹی پر کسا، اور جب وہ ہر طرح مطمئن ہوگیا کہ اس پرندے کا انڈا نقلی سونے کا نہیں ہے، تو اس نے ہاتھ بڑھایا اور سکوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ایک کونے سے اٹھایا، لکڑہارے کے سامنے رکھ دیا اور کہا: اس کے علاوہ بھی اگر تیرے پاس ہو تو میرے پاس لے آنا۔

لکڑہارا سمجھ ہی نہیں رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خواب میں دیکھ رہا ہے یا

بیداری میں۔اس نے تھیلا کندھے پر ڈالا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

جب گھر پہنچا تو سکوں سے بھرا تھیلا بیوی کے سامنے رکھ دیا اور کہا: بھاگوان! کیا اب بھی تجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں؟ پھر رقم سے بھرا یہ تھیلا اچانک کہاں سے آ گیا۔کیا تو نے اب تک اپنی پوری عمر میں اس قدر رقم دیکھی تھی؟

عورت بھی چمکدار سکے دیکھ کر، خوشی اور مسرت سے اپنے شوہر کی ہمنوا ہوگئی۔انہوں نے اتنی باتیں کی اور اتنے ہنسے کہ تم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

مختصر یہ کہ اس کے دوسرے اور تیسرے دن بھی سونے کے پروں والا پرندہ وعدہ کے مطابق طاق میں گیا اور انڈا دیا۔اب اس کے رخصت ہونے کا وقت تھا۔آخری رات کو جب پرندہ لکڑہارے کے گھر ہی میں تھا،لکڑہارے کی پرسکون زندگی میں اچانک ہلچل مچ گئی، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

کس وجہ سے؟ اس کو اب نیند نہیں آرہی تھی اور بقول کسے اس کے لالچ کی دیگ میں ابال آ گیا تھا۔شیطان اس کے جسم میں گھس گیا اور اس سے کہا: ارے بے نوا انسان! تو کیوں بلاوجہ اور خواہ مخواہ اس قیمتی پرندے کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے؟ جلدی کر، تہخانے کے ایک کونے میں جو پنجرہ رکھا ہے ، اسے اٹھا اور پرندے کو قید کر لے۔اگر پرندہ اڑ گیا تو پھر واپس آنے والا نہیں۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے..... لکڑہارا ان باطل خیالات سے دھوکہ کھا گیا تھا، اسی وقت چراغ کی روشنی میں اپنے گھر کے تہخانے میں گیا۔پنجرہ لایا اور سنہری پروں والے پرندے کو جو آرام سے سو رہا تھا، پکڑا اور پنجرے میں قید کر دیا۔

اس بیچارے پرندے نے علی الصبح جو آنکھ کھولی تو خود کو پنجرے میں قید پایا۔

لکڑہارا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پرندے کو اس پر یقین نہیں آیا کہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔ پرندے نے پوچھا: یہ کیا ہے، مجھے پنجرے میں کیوں ڈال دیا ہے؟

لکڑہارے نے، جو اب باتیں بنانا بھی سیکھ چکا تھا، ایک ہمدرد انسان کا روپ اختیار کیا اور کہا: تو بالکل پریشان مت ہو۔ میرا اس سے کوئی برا مقصد نہیں۔ میں تجھے ہمیشہ اس پنجرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے سوچا کہ تو چند روز اور یہاں قیام کر۔ تیری حالت جیسے ہی بہتر ہوجائے گی تجھے آزاد کردوں گا۔ بہر حال میں یہ نہیں چاہتا کہ چند روز پہلے کی طرح تیرے بال و پر پھر سے خون میں لت پت ہوجائیں اور تو کسی گوشے میں گر پڑے اور تیری مدد کو بھی کوئی نہ آئے۔

پرندہ پھڑپھڑایا اور کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ میری حالت اچھی ہے۔ اس سلسلے میں اب تو فکرمند نہ ہو۔ دوسری یہ کہ میں خود یہ جانتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے تاکہ پہلے کی طرح میرے بال و پر زخمی نہ ہوں۔ لیکن اے انسان آ اور اپنے دل کی بات بیان کر..... اس پنجرے سے کیا تیرا یہ مقصد نہیں کہ میں پھر سے سونے کا ایک انڈا دوں اور تو جتنا اب تک کما چکا ہے، اس سے زیادہ مال تیرے ہاتھ لگے؟

لکڑہارے نے اپنا سر جھکا لیا اور جواب دیا: ٹھیک ہے، ایسا کون سا انسان ہے جسے بہت زیادہ مال و دولت بری لگتی ہو؟

سنہری پروں والے پرندے نے کہا: بہت زیادہ مال و دولت کسی کو بری نہیں لگتی، لیکن یہ سمجھ لے کہ تیری یہ آرزو تجھے پریشانی اور مشکل میں ڈال دے گی۔ اس سے پہلے کہ دیر ہوجائے، پنجرے کا دروازہ کھول دے اور مجھے یہاں سے اڑجانے دے۔

لکڑہارا مسکرایا اور اس نے کہا: اتنی آسانی سے؟ ہر شخص کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کے پاس تیرے جیسا پرندہ ہو۔ پھر بھی تو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ پنجرے کا دروازہ کھول دوں اور تو اڑ جائے اور چلا جائے؟

سنہری پروں والے پرندے نے ایک آہ بھری اور کہا: بہر حال تجھے آگاہ کرنا میرا فرض تھا، اب تو جو چاہے کر۔

ابھی پرندے کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ لکڑہارے کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ لکڑہارا بھاگا اور صحن کا دروازہ کھول دیا۔ اچانک اس نے دروازے کے سامنے شہر کے قوی ہیکل داروغہ کو کھڑا دیکھا۔

داروغہ بغیر اجازت لیے لکڑہارے کے گھر میں داخل ہوگیا اور اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ اس گھر میں کچھ خاص بات ہو رہی ہے۔

لکڑہارا پریشان ہوگیا۔ اس نے دریافت کیا: داروغہ صاحب کیسی باتیں؟

داروغہ زیادہ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا: سن میں حد سے زیادہ تھکا ہارا ہوں۔ ہزاروں مشکلوں سے پوچھتے پوچھتے تیرا گھر ملا ہے۔ اب یہی چاہتا ہوں کہ حقیقت بتادے تاکہ تیرا پیچھا چھوٹے۔ ارے انسان! کیا یہ صحیح ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ تیرے پاس ایسا پرندہ ہے جو سونے کا انڈا دیتا ہے؟

لکڑہارے نے کہا: داروغہ صاحب آپ کیا بات کر رہے ہیں! آیئے میں آپ کے لیے مٹھائی بنواتا ہوں اور مٹکے سے ٹھنڈا پانی لاتا ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ لب تر میرے گھر آئیں اور لب خشک یہاں سے باہر جائیں۔

داروغہ اب سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے کہا: نہ میں بھوکا ہوں اور نہ پیاسا، مجھے صرف اتنا بتا کہ اس قسم کا پرندہ تیرے گھر میں ہے یا نہیں۔

لکڑہارے نے جواب دیا: مجھے صحیح معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کس نے دشمنی

کی ہے اور یہ خبر آپ کو پہنچادی ہے۔ لیکن میرے تو فرشتے بھی اس خبر سے ناواقف ہیں۔

اس وقت سنہرے پر والے پرندے نے بولنا شروع کردیا۔ داروغہ لکڑہارے کے گھر کے کمرے میں گیا اور پنجرے اور پرندے کو دیکھ لیا۔

پنجرہ دیکھ کر اس نے کہا: واہ، میری تو آنکھیں روشن ہوگئیں! بادشاہ کے مخصوص پرندے کو پنجرے میں قید کر رکھا ہے اور کہتا ہے کہ ایسی کوئی چیز تیرے پاس نہیں۔ لکڑہارے نے جواب دیا: داروغہ صاحب! یقین کیجئے۔ مجھے یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ رنگین پر وبال کا پرندہ بادشاہ کے محل سے اڑکر آ گیا ہے۔

داروغہ نے اپنے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں کیے اور کہا: اچھا، جب نہیں جانتا تھا تو پھر تیرے گناہ کا بوجھ زیادہ نہیں ہے۔ اب اس لیے کہ یہ خبر کسی حال میں بھی بادشاہ کے کانوں تک نہ پہنچے، سونے کے انڈے بیچنے سے جو رقم تجھے ملی ہے وہ سب مجھے دے دے، ورنہ تجھے ایسی جگہ پھینکوں گا کہ عرب بھی ایسا نہیں کرتے۔

لکڑہارے کو کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔ اس نے سکوں کے تینوں تھیلے نہایت دکھ کے ساتھ داروغہ کے حوالے کردیے تا کہ وہ بادشاہ کی دستبرد اور اس کی پھانسی کے تختے سے اپنی جان بچا سکے۔

داروغہ نے بھی نہایت خوشی اور سرور کے ساتھ، لکڑہارے کی نادانی پر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے، پرندے اور پنجرے کو اٹھایا اور اپنے گھر چلا گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس ماجرے کی کسی کو خبر نہ ہو۔ اس نے پرندے کو اپنے گھر کے ایک کمرے کے گوشے میں چھپا دیا اور انتظار کرنے لگا کہ پرندہ سونا کا انڈا دے۔

سنہری پروں والا پرندہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلدی ہو سکے اپنی جان بچائے اور اس شہر سے چلا جائے، پرندے نے کہا: تو نے مجھے کیوں قید کیا ہے؟

داروغہ نے کہا: میری آرزو ہے کہ بے حد وحساب دولت کا مالک بن جاؤں۔ اس لیے جب تک تو میرے لیے سونے کا انڈا نہیں دے گا، تیری آزادی اور پنجرے کے دروازے کے کھلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بالکل نہیں۔

پرندے نے کہا: ٹھیک ہے، اب اگر ایسا ہی ہے تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کر۔

داروغہ نے کہا: تو وہ کام انجام دے جو میں چاہتا ہوں میں بھی ہر ایسا وعدہ کرنے کو تیار ہوں جو لازمی ہے۔ پرندے نے کہا: مجھ سے وعدہ کر کہ تین دن کے بعد کہ میں تیرے لیے تین انڈے دوں گا، مجھے قید و پنجرے سے آزاد کر دے گا۔

داروغہ نے کہا: بس اتنا ہی؟ ٹھیک ہے۔ یہ تو کوئی مشکل بات نہیں تو اپنا وعدہ پورا کر میں بھی تین دن بعد اس پنجرے کا دروازہ کھول دوں گا تا کہ تو جہاں چاہے چلا جائے.....

داروغہ نے بظاہر پرندے سے یہ وعدہ کرلیا لیکن اس نے اپنے دل میں کہا: اگلے تین دنوں میں تجھے آزاد کردوں؟ اگر تو سونے کا انڈا دے گا، تین روز میں تو محال ہے، اگلے تین سال بھی پنجرے کا دروازہ تیرے لیے نہیں کھولوں گا۔

تین دن گذر گئے یہ تینوں دن داروغہ کے لیے خوشی ومسرت کے دن تھے چوں کہ رنگین پروں والا پرندہ سونے کا ایک انڈا دیتا تھا۔

چوتھے دن، پرندے نے داروغہ سے کہا: ٹھیک ہے ارے انسان! اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ اپنا وعدہ پورا کر، پنجرے کا دروازہ کھول تا کہ میں اڑ جاؤں اور اپنے طور زندگی گذاروں۔

داروغہ نے جو یہ سنا تو قہقہہ مارا اور کہا: تو دنوں کا حساب خوب اچھی طرح رکھتا ہے۔ میں نے ایک بات کہی نہ کہی، تو کیوں اس پر یقین کرتا ہے؟ تو خود بتا۔ اگر تو میری جگہ ہوتا، کیا یہی کرتا؟ پرندہ پھڑ پھڑایا اور اس نے کہا: میں تیری جگہ نہیں ہوں، لیکن تو نے جو قول و قرار باندھا تھا، اس پر تجھے عمل کرنا چاہیے اب جلدی کر۔ پنجرے کا دروازہ کھول اور مجھے اڑ جانے دے..... اگر تو سونے کے ان انڈوں کو بیچے گا تو تیری زندگی کی حالت بہتر ہوجائے گی۔ اور اگر تو نے مجھے اڑ جانے نہیں دیا تو ایسی بلا میں گرفتار ہوجائے گا کہ اس لالچ کی وجہ سے باقی عمر تو کبھی اچھی زندگی کا منھ بھی نہ دیکھ سکے گا۔

داروغہ نے کہا: تو میری اچھی یا بری زندگی کی فکر نہ کر، میرے لیے صرف سونے کے انڈے دیتا رہ۔

خوبصورت پروں والے پرندے نے کہا: بہر حال میرا فرض تجھے آگاہ کرنا تھا اب تو جان تیرا کام جانے۔

پرندے کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ داروغہ کے گھر کے دروازے پر کسی نے آواز دی۔ داروغہ گیا اور دروازہ کھولا، وزیر کا بھیجا ہوا ایک شخص آیا تھا۔ اس نے وزیر کا پیغام پہنچایا: اگر خیریت چاہتا ہے، فوراً کھڑا ہو اور میری خدمت میں پہنچ جا۔

داروغہ بغیر کچھ سوچے سمجھے وزیر کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

وزیر نے داروغہ سے بڑی گرم جوشی سے خیریت پوچھی اور سوال کیا: داروغہ صاحب کیا خیر خبر ہے؟

داروغہ نے اسی حالت میں کہ وہ سینے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا، جواب دیا: حضرت وزیر! شہر میں بادشاہ سلامت اور آپ کے زیر سایہ سب امن و امان ہے۔

وزیر نے دریافت کیا: ہاں داروغہ جی! کیا تو نے اب تک ایسا پرندہ دیکھا ہے جو سونے کا انڈا دیتا ہو؟

داروغہ وزیر کے اس سوال سے لرز گیا اور کہا: آپ کیا بات کر رہے ہیں جناب! میں نے ایسا کوئی پرندہ نہیں دیکھا، لیکن سنا ضرور ہے کہ چین اور بہتر ملتوں کی سرزمین یعنی ہندوستان میں ایسا پرندہ ہوتا ہے۔

وزیر نے جو یہ جواب سنا تو آشفتہ ہوگیا اور کہا: داروغہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ یہ پرندہ اس وقت تیرے گھر میں موجود ہے۔

اس سے پہلے کہ وزیر داروغہ کو بولنے کی اجازت دے اور وہ کچھ کر سکے، وزیر کے کارندے گئے، پنجرے، پرندے اور اس کے سونے کے تین انڈے وزیر کی خدمت میں لے کر حاضر ہو گئے۔

داروغہ نے جو یہ دیکھا، اس نے تو اپنا سر پیٹ لیا۔ اب اسے رنگین پروں والے پرندے کی آخری بات یاد آئی، لیکن اب دیر ہو چکی تھی اور آہ اور افسوس کرنا اس کی مشکل آسان نہیں کر سکتے تھے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو وزیر نے داروغہ کو اس کی ذمہ داریوں سے برخاست کر دیا اور داروغہ کے دفتر میں ایک کمتر درجے کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اس طرح لالچی داروغہ نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔

اب وزیر کی قسمت و اقبال کا ستارہ عروج پر تھا۔ وزیر نے لکڑہارے اور داروغہ کے برخلاف تین دن ہی صبر کرنے پر قناعت نہیں کی، اس نے سنہرے پروں والے پرندے سے ہر روز سو انڈے دینے کی درخواست کی۔

پرندے نے پوچھا: وزیر! تجھے اس سب کی کیا ضرورت ہے؟ تیرے پاس تو سب کچھ ہے، پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے؟

وزیر نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا: رنگین پر والے پرندے! تجھے معلوم نہیں۔ میں کوئی دو تین دن وزیر رہنے پر قانع رہوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بادشاہ بن جاؤں۔ میرے پاس بہت زیادہ سونا ہو، لاؤلشکر ہو اور اس مملکت کا مطلق العنان بادشاہ بن جاؤں..... آخر میرے پاس بادشاہ سے کیا چیز کم ہے؟ اس کا بھی میری طرح ایک سر اور دو کان ہیں۔ ہاں..... اے سنہری پروں کے پرندے! انسان کی آرزوؤں کی فہرست بڑی لمبی چوڑی ہے۔

پرندہ پھڑ پھڑایا اور پہلے کی طرح اس نے پھر کہا: وزیر صاحب! کہنا میرا فرض تھا اگر کسی دن مصیبت میں پھنس گئے اور میں تمہارے حلق کی ہڈی بن گیا تو مجھ سے گلہ شکوہ مت کرنا۔

وزیر ہنسا اور بولا: سونا اور بلا! اس طرح کی باتیں کس نے کی ہیں؟

وزیر بھی دو تین دن اس پرندے کے ساتھ اپنی آرزوئیں پوری کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اچانک بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔

وزیر ڈرا سہا بادشاہ کے محل میں حاضر ہوا۔ تعظیم بجالایا اور عرض کیا: حضور والا! کیا حکم ہے؟

پتا چل رہا تھا کہ بادشاہ بہت غصے میں اور رنجیدہ ہے۔ بادشاہ نے پوچھا: کہیے وزیر صاحب! تو پہلے تو ایسا نہیں تھا، ایسے حال و احوال نہیں تھے۔ آخر کیا بات ہے کہ اب مجھ سے خبروں کو چھپاتے ہو؟

وزیر نے عرض کیا: بادشاہ پر میری جان قربان! اس دن زندہ نہ رہوں جس دن کوئی بات حضور والا سے پوشیدہ رکھوں۔

بادشاہ نے کہا: باتیں بنانا چھوڑ، تو نے اس پرندے کے بارے میں خبر مجھ سے کیوں چھپائی جو سونے کا انڈا دیتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ بری نیت اور ارادہ

رکھتا ہے؟ لازمی طور پر اس سونے کی رقم سے فوج اور ہتھیار مہیا کرنا چاہتا ہے، اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی کہ وہ پرندہ تیرے گھر میں ہے؟

کیا اب میرا یہ حق نہیں کہ اس خیانت کی خاطر تیرا سر تن سے جدا کردوں؟

اس سے قبل کہ وزیر کچھ عرض کرے، اس کو وزارت سے سبکدوش کر دیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اب وہ سنہری پروں کا پرندہ بادشاہ کی ملکیت تھا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے لیے ایک بڑا پنجرہ بنایا جائے۔ وہ خود چھوٹا پنجرہ اپنے محل میں لایا۔ اس کا دروازہ کھولا تا کہ پرندے کو نکال کر بڑے پنجرے میں ڈال دے۔

پرندے نے موقع غنیمت جانا، وہ اڑ گیا، کچھ دیر محل کے ہال میں چکر لگاتا رہا اور پھر ایک کھڑکی سے محل کے باغ میں اڑ گیا، بادشاہ دیوانہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر پرندے کے پیچھے بھاگا اور جب اسے پکڑ نہیں سکا تو اس درخت کے نیچے گیا جس پر پرندہ بیٹھا ہوا تھا۔ پھر بچوں کی طرح بلکتے ہوئے اس نے درخواست کی: اے پرندے لوٹ آ! تو جو کچھ کہے گا تجھے مہیا کردوں گا۔ آخر تو کیسا پرندہ ہے کہ یہ محل تجھے پسند نہیں آ رہا ہے؟

پرندے نے کہا: میں اب پنجرے میں واپس آنے والا نہیں، میری جگہ پنجرے میں نہیں ہے اور یہ جو تو نے کہا کہ میں کیسا پرندہ ہوں، ٹھیک ہے، تو سمجھ لے میں تو اس دنیا کی دولت و ثروت ہوں جس نے بھی مجھے صحیح صحیح استعمال کیا اور قانع رہا، وہ اطمینان سے رہا اور جس نے بھی لالچ کیا اور حد سے تجاوز کیا، وہ مشکلوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہوا۔ مخصوصاً تو نے میرے لیے ایک بڑا پنجرہ بنوا کر یہ دکھا دیا کہ تیری آرزوئیں اور تمنائیں بھی بہت بڑی ہیں۔ کاش! تو نے

ان لوگوں کے حالات سے سبق لیا ہوتا جو تجھ سے پہلے گرفتار بلا ہوئے۔

بادشاہ نے جو یہ باتیں سنیں تو افسوس کی وجہ سے زمین میں گڑ گیا۔ اس کی روح اس کے بدن سے جدا ہوگئی اور خوبصورت پروں کا پرندہ بھی اس جگہ سے اڑ گیا اور چلا گیا دور، دور، بہت دور۔

☆☆☆

جڑاؤ تلوار

برسوں پہلے ایک دور دراز ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا ایک وزیر تھا، انصاف پسند، رعیت پرور اور خدا پرست۔

وزیر کو حکومت، دربار، دبدبے اور اس کی شان وشوکت سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انسانوں کی عمر، دو دن کی زندگی میں بہرحال خوش ناخوش، خاک نشینی یا قصر نشینی میں گزر ہی جاتی ہے۔ بس اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ اپنی اچھی یا بری زندگی بیچاروں اور ناتوانوں کی خدمت میں گزر جائے تاکہ اس طرح دنیا میں بھی آرام سے گزرے اور آخرت میں بھی سرخروئی نصیب ہو۔

ہاں یہ تھے حالات۔ وقت گزر رہا تھا اتنے میں کچھ درباریوں کی جو ہمیشہ سے خدا سے دور اور بادشاہ کے خوشامدی تھے، لالچ کی دیگ میں جوش آیا۔

کس لیے؟ اس لیے کہ وہ چاہتے تھے کہ حد سے زیادہ کھائیں، اور بیہودہ خرچ کریں اور ایک لمحے کے لیے بھی محرموں، بھوکوں اور بیچاروں کی فکر نہ کریں۔

خدا پرست وزیر نے جو ہوشیاری اور دوراندیشی سے حالات پر نظر رکھتا تھا، کچھ دیر تو صبر کیا اور کچھ نہ کہا تاکہ وہ ہوسکے تو ہدایت کے سیدھے راستے پر آجائیں اور اِن افسوسناک کاموں اور برے شوقوں سے باز آجائیں۔ جب اس

نے محسوس کیا کہ معاملات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں،تو وہ انہیں عزت واحترام سے اپنے کمرے میں لے گیا اوران سے اکیلے میں کہا: دوستو اور ساتھیو! دن سے زیادہ یہ بات روشن ہے کہ ملک کے خزانے میں تمہارا بھی حق ہے اوراس میں سے تمہیں بھی حصہ ملنا چاہیے، لیکن اگر حالات یہی رہے اورتم لوگ اسی طرح بے حد وحساب خرچ کرتے رہے،تو وہ دن دورنہیں کہ ملک کے خزانے میں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔آخر دریا بھی ہوتو بالآخرختم ہوجاتا ہے۔

بادشاہ کے درباری اورحوالی موالی اس قسم کی توقع نہیں کرتے تھے۔انہوں نے وزیر کی باتوں پر اعتراض کیا اور کہا: ہم اسی طرح زندگی گزارتے آئے اور بڑے ہوئے ہیں۔بہرحال ہرشخص کاایک فرض ہے۔تمہارا ایک کام یہ بھی ہے کہ لوگوں سے ٹیکس وصول کرو اور ملک کے خزانے کو ہمیشہ بھرا ہوا رکھو..... اگرتم بادشاہ کی اس طرح خدمت نہیں کرسکتے تو تمہیں چلے جانا چاہیے اوراپنی جگہ کسی دوسرے کے سپرد کردینی چاہیے جو بادشاہ اوردربار کی تم سے بہترخدمت کرسکے۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ جب وزیر نے دیکھا کہ معاملہ یہ ہے اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے،تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس مسئلے کوخود بادشاہ کے گوش گزار کردے۔

اس لیے وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضرہوا اور اس کے درباریوں اور حوالیوں کی دست درازیوں کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا،اس کو بتادیا۔

بادشاہ اس خبر سے ہل گیا لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وزیر کو ناامید کرے۔اس نے کہا: اچھا، کیا تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کن لوگوں کے بارے میں بات کررہا ہے؟ وہ سب لوگ جن کے بارے میں تو کہتا ہے کہ مملکت کے خزانہ میں دستبرد کررہے ہیں، میرے نزدیکی لوگ اورعزیز ہیں۔تو سمجھ لے اورآگاہ ہوجا کہ اگرتو نے یہ الزام تراشی کسی خودغرضی، کینے یا حسد کی وجہ سے کی

ہے، تو پھر میں یہ حکم دوں گا کہ تیرا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔

وزیر نے پوچھا: ٹھیک ہے بادشاہ سلامت! اب اس کا حل کیا ہے؟ کیا میں اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں اور دیکھتا رہوں؟ اب اگر میں یہ ثابت کرنا چاہوں کہ میں نے یہ شکوہ شکایت کسی خودغرضی اور برے مقصد سے نہیں کی ہے، تو میں پھر کیا طریقہ اختیار کروں؟

بادشاہ نے کہا: مجھے تجھ سے بہت زیادہ تعلق خاطر ہے۔ تجھے کچھ دن کی مہلت دیتا ہوں کہ اپنی ان باتوں کے ثبوت میں کوئی دلیل اور سند پیش کر۔

وزیر نے کچھ سوچا اور پھر کہا: اس سے بہتر دلیل وثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں گے زندگی گزاریں گے اور اسی طرح وہ بڑے ہوئے ہیں۔

بادشاہ نے جواب دیا: ٹھیک ہے۔ اگر میں انہیں ابھی یہاں بلاؤں گا تو وہ کہیں گے کہ انہوں نے یہ بات نہیں کی ہے۔ ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ پھر تو کیا جواب دے گا؟

جب وزیر نے بادشاہ سے یہ بات سنی تو وہ سوچ میں پڑ گیا اور کہا: بادشاہ سلامت یہ صحیح ہے۔ میرے پاس اس وقت دلیل وثبوت نہیں کہ پیش کروں، لیکن میری درخواست ہے کہ مجھ پر اعتماد کیجئے۔ مجھے کچھ اور اختیارات دیجیے تاکہ میں اپنے اس دعوی کے ثبوت میں ضروری دلایل اور اسناد حاصل کرسکوں بادشاہ نے پوچھا! کیا اختیارات؟ کیا یہی کافی نہیں کہ تو ہمارا وزیر ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہے؟

وزیر نے کہا: اب تک ملک کے تمام خزانوں اور جواہرات کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ چند روز کی اجازت دیجئے کہ یہ تمام کام میرے اختیار میں ہوں۔

بادشاہ نے کہا: عجیب بات ہے۔ تو خود جانتا ہے کہ اس طرح کس قدر خطرناک کام کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کام کی وجہ سے اپنی زندگی اور اپنی کل پونجی کو تو برباد کر دے گا۔

وزیر مسکرایا اور اس نے کہا: حضور والا! آپ مطمئن رہیے۔ بہرحال یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو بے حساب کتاب مملکت کا خزانہ لوٹ رہے ہیں اور کھا رہے ہیں، مجھے دلیل اور سند حاصل کرنی ہے۔

بادشاہ نے جب یہ صورت حال دیکھی، اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وزیر کو بہانہ بھی نہ مل جائے، تو خزانچی کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور اس سے کہا: اچھی طرح سن لے اور جو حکم میں صادر کر رہا ہوں اس پر توجہ سے عمل کر۔ آج سے مملکت کے خزانے کا اختیار وزیر کے ہاتھ میں ہے..... اس لیے تو اور وہ جن کو تو احکام دیتا ہے، اس وقت تک کہ خود میں تجھ سے نہ کہوں، سراپا گوش ہو جاؤ، اور جو کچھ وزیر کہے اس پر عمل کرو۔

خزانچی نے تعظیم میں سر خم کیا اور عرض کی: حکم بجالاؤں گا۔ وہ چلا گیا اور بادشاہ کے حکم کو اپنے ماتحتوں کو بھی سنا دیا جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو بادشاہ کے درباریوں اور حوالی موالیوں کی مملکت کے خزانے تک رسائی ممکن نہیں رہی۔ اب وزیر بال کی کھال نکالتا اور تمام چیزوں کی آمد و خرچ کا حساب کتاب رکھتا تھا۔

انہوں نے کچھ عرصے صبر کیا۔ اس لیے کہ اب دربار کے خزانے تک ان کی رسائی نہیں ہو رہی تھی، وہ خون کے آنسو رو رہے تھے۔ آخر کار انہوں نے سوچا، نہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں..... اگر حالات یہی رہے تو پھر آج یا کل ہمارا مواخذہ بھی ہو سکتا ہے۔ اب وہ کسی پلان کی فکر میں پڑ گئے۔

کیسا پلان؟ ہاں، انہوں نے یہ بنیاد بنائی کہ وہ شاہی خزانے سے کچھ جواہرات باہر نکالیں۔ کچھ مدت انہیں کہیں چھپائے رکھیں تا کہ اس طرح وزیر بادشاہ کی نظروں سے گر جائے اور بالآخر پھانسی کے تختے تک پہنچ جائے۔

ایک زمانے سے درباری ملک کے خزانے سے کھا رہے تھے۔ اسی دوران وہ خزانچی کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے تھے..... یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک دن خزانچی سے اکیلے میں ملنا طے کیا تا کہ وزیر کے کاموں کے سلسلے میں باہم بات چیت کریں۔

بالآخر وہ چوری چھپے ایک جگہ جمع ہوئے۔ درباریوں نے خزانچی سے کہا: وزیر نے اس رنگا رنگ دسترخوان تک تیری رسائی بھی ناممکن بنا دی ہے۔ اب اس لیے کہ حالات اور زیادہ خراب نہ ہو جائیں، ہمیں کوئی علاج کرنا چاہیے۔

خزانچی نے درباریوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا: یہ صحیح ہے، لیکن میں اس بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟

ایک درباری نے کہا: اتفاق کی بات ہے کہ تمام کام تو ہی کر سکتا ہے۔

خزانچی نے پوچھا: یعنی کیا کام؟

درباریوں نے کہا: وزیر کی آنکھوں سے دور، سلطنت کے جواہرات میں سے کچھ جواہرات نکال لے اور انہیں کہیں چھپا دے۔ خزانچی ان کی اس تجویز سے ڈر گیا۔ لرز گیا اور کہا: لیکن یہ بہت خطرناک کام ہے..... ممکن ہے اس طرح میں مارا جاؤں۔ اگر بادشاہ کو اس کی خبر ہو گئی، تو پھر کیا ہو گا؟

انہوں نے خزانچی کی ہمت بندھائی اور کہا: کسی چیز سے ڈرو نہیں..... بادشاہ ان باتوں سے واقف نہیں ہو گا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ یہ تیرا کام ہے..... اور پھر یہ کہ ہم نہیں چاہتے کہ جواہرات ہمیشہ کے لیے خزانے سے

لے جائیں..... ہمارا مقصد اور غرض تو یہ ہے کہ اس کام سے، وزیر کو مزہ چکھادیں۔

اور اگر کہیں کوئی واقعہ پیش آ بھی گیا تو ہم تیرا دھیان رکھیں گے اور تیرے سر پر کوئی بلا نازل ہونے نہیں دیں گے۔

جب خزانچی نے ان نابکاریوں کی یہ باتیں سنیں، تو اس کا دل پسیج گیا اور چند گھنٹوں بعد اس نے وہی کام کیا جو درباری چاہتے تھے۔

اتفاق سے دو دن بعد دربار عام کا دن تھا۔

شاہ نے خزانچی کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ جائے اور مخصوص جواہرات لے آئے تا کہ وہ انہیں اپنے سینے اور سر پر پہن سکے۔

خزانچی چلا گیا اور منہ لٹکائے واپس آیا اور کہا: میں قبلۂ عالم کے قدموں کی خاک کو بوسہ دیتا ہوں، میں نے بہت کوشش کی لیکن جو جواہرات آپ نے منگائے تھے وہ میں ڈھونڈ نہیں سکا۔

بادشاہ اس خبر سے برافروختہ ہوگیا اور اس نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے۔تو نے شاید اچھی طرح ڈھونڈا نہیں۔خزانچی تعظیم بجالایا اور کہا: قبلہ عالم! اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آپ خود تشریف لے چلئے اور ہر چیز دیکھ لیجئے۔بادشاہ بہت حیران ہوا ایسے کہ اگر چھری ماردو تو خون نہ نکلے۔اس نے فوراً وزیر کو بلایا اور کہا: وزیر! اب مجھے بتاؤ کہ میرے جواہرات کا کیوں اتا پتا نہیں.....اس محل میں اس طرح کے اتفاقات رونما نہیں ہوتے تھے، لیکن جب سے تو نے سارے خزانے کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لیا ہے، میرے مخصوص جواہرات گم ہوگئے، اب بتا میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں؟

وزیر سمجھ گیا کہ ان بے دین لوگوں نے یہ پلان بنایا ہے۔اس نے جواب

دیا: عالی جناب! مجھے چند دن کی مہلت عنایت فرمایئے تا کہ وہ جواہرات ڈھونڈ سکوں۔

اب بادشاہ کوئی معقول بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔اس نے کہا: اب بھی تو مجھ سے چند روز کی مہلت چاہتا ہے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر چاہوں کہ پھر سے تجھے وقت دے دوں، لوگ یہ تخت میرے پیروں کے نیچے سے کھینچ لیں گے اور چلے جائیں گے۔

وزیر نے کہا: حضور والا! آپ اطمینان رکھیے..... اس بار میں چوروں کو پکڑلوں گا..... اگر مجھ پر اور میری باتوں پر آپ کو اعتماد نہیں ہے، تو مجھے عرض کرنے دیجئے کہ میں اس راستے پر اپنی جان قربان کر دوں۔

اس کے بعد، وزیر اکیلے میں گیا اور اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول ہوگیا۔اے خدا! تو جانتا ہے کہ سوائے تیرے میرا کوئی یار و مددگار نہیں۔اگر میں بھی اس طرح مصیبت میں گرفتار ہوگیا اور تھک ہار گیا، اپنی خاطر نہیں، بلکہ تیرے مصیبت زدہ اور ضرورت مند بندوں کی وجہ سے ہوگا۔ان دنوں کہ سب دروازے میرے لیے بند ہیں، تو آ اور میری مدد کر۔

خداپرست وزیر کچھ دنوں اسی حال و احوال میں گرفتار رہا۔پھر دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

اس وجہ سے اب وہ کھڑا ہوا اور سراسیمگی کی حالت میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اکیلے میں اس سے کہا: عالی جناب! کیا آپ کی نظر میں یہ عیب اور نامناسب بات ہے کہ شاہی جڑاؤ شمشیر چند روز کے لیے مصلحتاً چوری ہوجائے؟

بادشاہ نے جو یہ بات سنی تو بس وہ حیرت سے اپنے تخت سے گرنے ہی

والا تھا۔

وہ اصلاً یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک روز کے لیے بھی اس تلوار کے بغیر زندہ رہ سکے گا۔ اسی وجہ سے بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔ اس کی بھنویں چڑھ گئیں اور اس نے کہا: وزیر صاحب! اب تو نے کیا پلان بنایا ہے جتنا چور لے گئے، کیا وہ کافی نہیں؟ اگر یہ تلوار لوٹائی نہیں گئی تو پھر کیا ہوگا؟

وزیر نے لاپروائی سے کہا: حضور والا! خزانچی کے لوگوں میں سے ایک آپ کی یہ تلوار چرائے گا اور مصلحتاً کہیں چھپا دے گا..... اس دن محل کے سارے لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور ان سے ہم کہیں گے کہ اگر چور نے خود اپنا تعارف نہیں کرایا اور اس نے یہ نہیں بتایا کہ تلوار کہاں رکھی ہے، تو پھر پھانسی کا تختہ اس کا منتظر ہے۔ اس کے بعد ایک نقلی چور جسے میں جانتا ہوں، انکار کرے گا اور کہے گا کہ وہ اصلاً اس قصے سے واقف نہیں اور اس نے تلوار دیکھی تک نہیں ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچے گی، میں جلاد سے کہوں گا کہ وہ نقلی چور کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دے۔ وہ نقلی چور بھی جب خود کو خطرے میں دیکھے گا، کہے گا کہ جڑاؤ تلوار کہاں ہے اب جواہرات کے چور جب یہ صورت حال دیکھیں گے تو اپنے آپ ہوش میں آ جائیں گے اور اس سے پہلے کہ آپ کے اور دوسروں کے سامنے ان کی بے آبروئی ہو جواہرات کو ان کی جگہ پر رکھ دیں گے..... وہ لوگ جو جواہرات کو ان کی جگہ رکھیں گے، یہ وہی لوگ ہوں گے جو برسوں سے خزانے میں دست درازی کرتے آ رہے ہیں اور ان کا یہ قصد ہے کہ مجھے بادشاہ کی نظروں میں نالائق اور بے استعداد ظاہر کریں۔

بادشاہ نے کچھ سوچا اور کہا: تو نے اچھا پلان بنایا ہے اور اگر یہی تلوار حقیقت میں چوری ہوگئی، اس وقت تیرا جواب کیا ہوگا؟

وزیر نے کہا: حضور اقدس! تلوار کہیں نہیں ہوگی جو چوری ہوجائے۔ میں اسے کسی جگہ چھپادوں گا۔ آپ اس دن کہ طے ہے جواہرات کے چور کو پہچان لیا جائے، صرف موجود رہیں۔

بادشاہ نے کچھ غور کیا اور رضامندی میں اپنا سر ہلادیا: چلو ٹھیک ہے، مجھے امید ہے کہ جس قدر جلد ہوسکے تو چوروں کو ظاہر کردے ورنہ مجھے مجبوراً اعلان کرنا پڑے گا کہ اصلی چور تو ہے۔

وزیر نے احترام میں سر ہلادیا اور محل کے ہال سے باہر چلا گیا۔ اس کے کپڑوں کے نیچے بادشاہ کی جڑاؤ تلوار چھپی ہوئی تھی، وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچا، خزانچی کے ایک ملازم کو آواز دی۔ وہ وزیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور خدمت بجالانے کے لیے کھڑا رہا۔

وزیر نے اس جوان کے ساتھ پوری بات کرنے اور اس سے اپنا تعلق خاطر ظاہر کرنے کے بعد، اپنا پلان اس کے سامنے رکھ دیا۔

خزانچی کا ملازم اب تک خاموش کھڑا تھا اور صرف وزیر کی باتوں کو سن رہا تھا، اس نے جواب دیا: آپ کا حکم بجالاؤں گا۔ لیکن میری جان امان میں رہے۔

وزیر نے کہا: تم بالکل مطمئن رہو..... میں تیرا بال بھی بیکا ہونے نہیں دوں گا اور اگر بادشاہ بھی تیرے خلاف کچھ کرے گا تو میں تیرے لیے سپر بن جاؤں گا۔

اس شخص نے کہا: ٹھیک ہے۔ یہ تلوار کہاں چھپائی جائے گی؟

وزیر نے جواب دیا: محل کی دیواروں کے ایک شگاف میں..... جیسے ہی کوئی مناسب جگہ مجھے مل جائے گی، تجھے اطلاع دے دوں گا۔

خزانچی کے ملازم نے وزیر کو سلام کیا اور اس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس جوان نے بظاہر وزیر کی اطاعت قبول کرلی لیکن وہ دل ہی دل میں وزیر پر

ہنس رہا تھا۔

درباریوں میں سے چند لوگ برسوں سے خزانچی کے تعاون سے ملک کے خزانے کو لوٹ کھسوٹ رہے تھے، کھا رہے تھے، اتفاقاً وہ شخص جو اپنے آقا خزانچی کی پیروی میں اس لوٹ کھسوٹ میں شامل تھا، یہی تھا۔

ہاں..... وہ گیا اور اس نے درباریوں کو اطلاع دی اور ان سے وزیر کے اس پلان کے بارے میں بتا دیا جو اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ خدا پرست وزیر خوف و وحشت سے کھڑا ہو گیا۔ وہ بادشاہ کی جڑاؤ تلوار کی طرف سے پریشان تھا جو دیوار کے ایک شگاف میں چھپا دی گئی تھی۔ اس نے خود سوچا: ٹھیک! اگر خزانچی کا وہ ملازم کسی وسوسے میں گرفتار ہو گیا اور اس جڑاؤ تلوار کو جس کے بارے میں جانتا ہے کہ کہاں چھپائی گئی ہے، اٹھا لے اور لے جائے تو پھر کیا ہوگا؟

ہاں..... وزیر غور و فکر کرنے کے بعد، اپنی جگہ سے اٹھا۔ پرانی تلوار اٹھائی۔ ہاتھ میں مشعل لی اور رات کے اسی اندھیرے میں اس نے بادشاہ کی مخصوص تلوار کو پرانی تلوار سے بدل دیا اور پھر سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے اپنے آپ یہ طے کیا کہ اس سے پہلے کہ خزانچی کا آدمی جائے اور تلوار لے آئے، وہ اس سے کہہ دے گا کہ تلوار خود وزیر کے کمرے میں ہے..... ہاں..... کسی طرح اس رات کی بھی صبح ہو گئی وزیر بادشاہ کے محل میں پہنچا اور بادشاہ سے کہا: عالیجاہ! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ غیر قانونی کام کرنے والوں اور نابکاروں کا تعارف ہو جائے اور وہ سب پہچان لیے جائیں۔

بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن خیال رکھ کہ تو اپنا سر قربان نہ کر دے۔

وزیر مسکرایا۔ وہ تعظیم بجا لایا اور چلا گیا۔

وہ خزانچی اور اس کے کارندوں کی تلاش میں گیا۔

اس کے بعد جلاد اور دوسرے چند درباری بھی آ پہنچے اور بادشاہ کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ خداپرست وزیر نے نیکی اور ثواب اور سچائی اور دوستی کے بارے میں گفتگو کرنے کے کچھ وقت بعد، خزانچی اور اس کے کارندوں کی طرف دیکھا اور کہا: آپ سے عرض کرتا ہوں کہ بادشاہ کی گراں قیمت جڑاؤ تلوار گم ہوگئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میں سے ایک نے جو ملک کے خزانے میں آتا جاتا رہتا ہے، وہ تلوار وہاں سے اٹھالی ہے۔ اب وہ شخص جس نے یہ خلاف قانون کام انجام دیا ہے، تیار ہے کہ بتائے اس تلوار کا کیا ہوا؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس خلاف قانون کام کرنے والے نے اپنا تعارف کرادیا تو اس کو غلطی کی سزا نہیں دی جائے گی۔

کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔

وزیر نے خزانچی سے پوچھ تاچھ شروع کی اور پوچھا: بادشاہ کی مخصوص تلوار گم ہوگئی ہے، جلاد کی تلوار کا انتخاب کرتا ہے یا حقیقت کا؟ خزانچی نے کہا: حقیقت کا۔

وزیر نے پوچھا: تجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے؟

خزانچی نے جواب دیا: بادشاہ کے تاج کی قسم مجھے معلوم نہیں۔

وزیر پھر اس کے پہلے کارندے کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا: بادشاہ کی جڑاؤ تلوار گم ہوگئی ہے، جلاد کی تلوار چنو یا حقیقت کو؟

اس نے جواب دیا: بادشاہ سلامت کے تاج کی قسم مجھے علم نہیں۔

خلاصہ یہ کہ وزیر نے خزانچی کے ہر ایک ملازم سے تحقیق کی۔ جیسے ہی وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کارندے سے بات کرے جس سے اس نے عہد و پیمان کیا تھا، اور

اس سے کچھ دریافت کرے، ایک درباری آگے بڑھا۔ تعظیم بجالایا اور بادشاہ سے کہا: عالی جناب! مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

درباری آگے آیا اور کہا: حضرت والا! اس طرح تو کوئی چور پکڑا نہیں جاسکتا، چونکہ ہر شخص کام کی لیاقت رکھتا ہے..... میں ایک وفادار درباری اور بادشاہ کے کان اور آنکھیں ہونے کی حیثیت سے نہ یہ جانتا ہوں کہ وہ مخصوص تلوار کہاں ہے، بلکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوسرے جواہرات بھی جو خزانے سے چرائے گئے ہیں، محل میں ایک خاص جگہ چھپا دیے گئے ہیں تا کہ مناسب وقت پر انہیں محل سے باہر پہنچایا جاسکے۔

وزیر کا تو یہ سن کر گویا قریب تھا دم نکل جائے، چوں کہ وہ اب سمجھ گیا تھا کہ اس نے جس پر اعتماد کیا تھا وہ درحقیقت چوروں کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔

اب وہ صرف ایک کام کرسکتا تھا اور وہ یہ کہ خدا سے درخواست کرے کہ اس کی مشکل آسان ہوجائے۔ اس وقت بادشاہ نے اس درباری کی طرف رخ کیا اور کہا: اچھا، وہ اب کہاں ہیں؟

درباری نے پھر بادشاہ کی تعظیم کی اور کہا: بادشاہ سلامت! میں ابھی آپ کی خدمت میں حاضر کردیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے خزانچی کے آدمی کی طرف اشارہ کیا کہ وہ جواہرات اور بادشاہ کی مخصوص تلوار جا کر لے آئے۔ خزانچی کے آدمی نے وزیر کی طرف دیکھا بھی نہیں اور بے شرمی و بے حیائی سے سر نیچے کیا اور چلا گیا۔ وہ وزیر بندۂ خدا اس قدر پریشان ہوا کہ اس کی زبان ہی بند ہوگئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ نامراد جوان اس قدر موذی ہوگا کہ اس طرح اس کے ساتھ خیانت کرے گا۔

وہ شخص وہاں سے چلا گیا، اچانک وزیر کا دل خوش ہوگیا۔

ہاں..... جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، وزیر نے بادشاہ کی تلوار کو پرانی تلوار سے بدل دیا تھا۔ مختصر یہ کہ خزانچی کا آدمی کچھ دیر بعد واپس آیا، اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور قدم بھی اٹھ نہیں رہے تھے۔

جب سب نے پرانی تلوار دیکھی، متعجب و متحیر رہ گئے۔ بادشاہ سب سے زیادہ وزیر پر غصے ہوا اور کہا: واہ بھئی وزیر! میری تلوار کہاں ہے؟ آخر اس محل میں ہو کیا رہا ہے؟

وزیر مسکرایا اور کہا: حضور چور مل گیا! آپ کی تلوار بھی صحیح سلامت ہے۔

پھر وزیر وہاں سے گیا اور بادشاہ کی تلوار دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

بادشاہ نے دریافت کیا: اب بتاؤ قصہ ہے کیا؟

وزیر نے جواب دیا: بادشاہ سلامت! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ بڑا مقصد جواہرات کے چوروں کو پکڑنا ہے..... اسی وجہ سے میں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ کی مخصوص تلوار مصلحتاً کہیں چھپا دی جائے..... میں نے البتہ کل رات اپنی تلاش کو حتمی بنانے کے لیے، جڑاؤ تلوار کو پرانی تلوار سے بدل دیا..... تلوار کو چھپانے کا معاملہ صرف تین لوگوں کو معلوم تھا۔ آپ، خزانچی کا آدمی اور میں خود..... البتہ میں نے خزانچی کے کارندے سے یہ نہیں کہا تھا کہ بادشاہ سلامت بھی اس معاملے سے باخبر ہیں..... اب کہ یہ خبر باقی لوگوں تک پہنچی اور جواہرات بھی مل گئے، تو چور کا پتا بتا دیا جائے۔

بادشاہ نے کچھ سوچا اور درباریوں پر نگاہ ڈالی اور کہا: اے نمک حرامو! اگر جواہرات گم ہو گئے، تو اس کی خبر اسے کہاں سے ہوئی؟ مزید برآں، شمشیر کا معاملہ میرے وزیر اور خزانچی کے درمیان تھا۔ تجھے اس کی خبر کیسے ہوئی؟

لازمی طور پر جب تجھے یہ احساس ہوگیا کہ وزیر آخر کار چور کو پکڑ لے گا اور اس کی بے عزتی کرے گا۔ تو نے پہل کی اور یہ سارا پلان بنایا۔

اس واقعہ کے بعد، چور رسوا ہوگئے اور وزیر اپنے مقام پر برقرار رہا اور جب تک اس دو روزہ دنیا میں زندہ رہا، اس کے زر و جواہرات میں گرفتار نہیں ہوا اور بے چارے اور بے نوا لوگوں کے ساتھ انصاف و ہمدردی کرتا رہا۔ جو کچھ اس کی مٹی ہے، تمہاری زندگی ہے۔

☆☆☆

سونے کا جام

برسوں پہلے پرانے زمانے میں یونان کی سرزمین پر ایک شخص رہتا تھا۔ وہ ایک خدا ترس انسان تھا جو ہمیشہ غمگین و افسردہ رہتا۔ ایک لمحے اور ایک لمحے کے لیے بھی کبھی وہ خوش نہیں ہوا۔ اس دائمی غمگین شخص کی وجہ سے اس کے اہل وعیال، بیوی بچے بھی مجبور تھے۔ رنج وغم واندوہ ان کی گردن میں لٹکے رہتے اور اس غمگین شخص کو دیکھ کر ان کے چہروں پر بھی پریشانی اور رنج کے آثار نمایاں رہتے۔

یہی حالات تھے کہ ایک روز اس کی بیوی نے اپنے غمگین شوہر کی طرف دیکھا اور کہا: اے غمگین انسان! بتا آخر کب تک تو اسی طرح دکھی اور رنجیدہ رہے گا؟ تو کب تک یہ چاہتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک تیرا غمگین چہرہ دیکھ کر غمگین و افسردہ رہے؟ تو کوئی کام کر، ہمت دکھا، کوشش کر..... تو کسی حکیم (عقلمند) کے پاس جا، دوا لے، کوئی علاج کر، آخر عمر تک تو اسی طرح رنجیدہ اور غمگین نہیں رہ سکتا۔

افسردہ دل انسان نے ایک آہ بھری اور ہر روز کی سی غمگین حالت میں اس نے جواب دیا! کیا کام کروں؟..... تو مجھے کوئی مشورہ دے، اگر اس پر عمل نہ کروں تو کہنا، مجھے بتا کس کے پاس جاؤں اور اس ناچاری کا علاج کس سے پوچھوں، تو جو بھی راستہ دکھائے اس پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔

اس کی بیوی نے کچھ سوچا اور کہا: میں کہتی ہوں کہ..... یہ کیسا رہے گا کہ تو حکیم افلاطون کے پاس جائے؟ میں نے جہاں تک خود دیکھا ہے اور اس کے بارے میں سنا بھی ہے، وہ ہمیشہ خوش خرم رہنے والا شخص ہے اور جو بھی اس سے ملتا ہے اسے راحت اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ تو آج ہی اس کے پاس جا، ممکن ہے وہی تجھے کوئی راستہ دکھائے۔

غمگین شخص نے پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: اس کے باوجود کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس جانے اور اس سے اپنی تکلیف کا مداوا معلوم کرنے سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی اس لیے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بیوی کی بات نہ مانوں اور اس کو شرمندگی اٹھانی پڑے، اس لیے میں جا رہا ہوں اور افلاطون کے سامنے اپنے دل کا دسترخوان کھول کر رکھ دوں گا۔

اس قول و قرار کے بعد وہ افسردہ دل شخص حکیم افلاطون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام علیک، احوال پرسی اور آپ کیسے ہیں کے بعد، اس پر اب تک جو کچھ بیتی تھی، اس نے کہہ سنائی اور اس سے اس کا علاج دریافت کیا۔ افلاطون نے کچھ دیر غور کیا اور جواب دیا: اچھا ایسا ہے، اگر تو غمگین نہیں رہنا چاہتا تو تجھے اس دنیا میں کسی بھی چیز سے دل نہیں لگانا چاہیے تاکہ تو اس کے تلف ہو جانے پر غم و اندوہ کا شکار نہ ہو۔

افسردہ دل شخص نے کہا: حضرت افلاطون! کیا اس دنیا میں کسی چیز سے کوئی تعلق خاطر نہیں رکھنا چاہیے؟

افلاطون نے سر ہلایا اور جواب دیا: ہر شخص کسی نہ کسی اچھی چیز سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی چیز سے دل لگانا اور اپنی ہستی و نیستی کو اس چیز کی قسمت سے جوڑ دینا اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف یہ غم و اندوہ کا باعث ہوتا ہے۔ اب مجھے بتا

کہ تو کس چیز سے بہت زیادہ دل لگائے ہوئے ہے؟

افسردہ شخص نے کچھ سوچا اور کہا: میں نے کسی چیز سے دل نہیں لگایا ہے۔

افلاطون نے کہا: یہ ممکن نہیں..... اب مجھے ایک حکایت بیان کرنے دے۔ جب وہ حکایت ختم ہوگی تو ممکن ہے تجھے یاد آجائے کہ تو نے آخر کس چیز سے اس قدر زیادہ دل لگالیا ہے کہ اس کو اپنی ہستی کے تار و پود سے جوڑ لیا ہے۔

غمگین دل شخص کو سب چھوٹوں بڑوں، بوڑھوں اور جوانوں کی طرح قصہ سننے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کہا جناب افلاطون! بہت اچھے، بیان کیجیے۔ میں سراپا گوش ہوں۔ امید ہے کہ اپنی افسردگی کا راز مجھے اس حکایت میں مل جائے گا جو آپ سنانے والے ہیں۔

افلاطون نے بغیر کچھ کہے سنے، سر ہلایا اور پھر کہا: برسوں پہلے روم میں ایک بڑا طاقتور بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کو سونا اور جواہرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ جہاں سے بھی ممکن ہوتا، سونا اور جواہرات جمع کرتا رہتا اور انہیں اپنے خزانے میں محفوظ رکھتا۔ انہیں دیکھ کر اور ان پر نظر ڈال کر وہ ہمیشہ خوش ہوتا۔ اب اگر اس کے شوق اور پسند کی کوئی حد ہوتی اور کہیں ختم ہوجاتی، تو اس میں چنداں عیب نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ روم کا بادشاہ سونا اور جواہرات جمع کرنے سے کبھی بھی سیر نہیں ہوا..... یہی وجہ تھی کہ ایک روز ایک مالدار تاجر روم آیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تاجر نے ان تمام چیزوں کے بارے میں جو اس نے روم میں دیکھی تھیں، بادشاہ کو تفصیل سے بتایا۔ اس نے ایک تھیلے سے جو اس کے ساتھ تھا، ایک جام نکالا اور قدردانی کے طور پر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا اور محل سے رخصت ہوا۔ بادشاہ اس اجنبی تاجر کے تحفے سے بے حد خوش تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا جیسے ہوا میں اڑ رہا ہو۔ درحقیقت یہ جام

بھی کوئی معمولی برتن نہیں تھا بلکہ یاقوت کا بناہوا جام تھا۔

مختصر یہ کہ اس کے بعد بادشاہ کے دن رات اسی جام کے خیال میں گزرنے لگے۔ عالم یہ تھا کہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی جام اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا اور وہ اس پر ہاتھ نہیں پھیرتا اور اسے نہیں چھوتا، جلدی غمگین ہوجاتا۔ اتفاق سے روم کے دربار میں کچھ حکیم (خردمند) تھے جو پریشانی اور نامساعد حالات میں بادشاہ کی مدد کرتے اور اسے مشورے دیتے تھے۔

ایک دن بادشاہ نے ان حکما کو اپنی خدمت میں بلایا اور یاقوت کے جام کو بھی پیش کرنے کا حکم دیا۔ خزانچی گئے اور وہ جام لے آئے۔

بادشاہ نے حکما کی طرف دیکھا اور کہا: کیا تم لوگوں نے اپنی پوری عمر میں ایسا جام دیکھا ہے یا اس کا نام سنا ہے؟

سب حکما نے اعتراف کیا کہ آپ صحیح فرمارہے ہیں، یاقوت کا یہ جام بے نظیر ہے۔

روم کے بادشاہ نے کہا: بس تو مجھے اس کا حق ہے کہ میں اسی قدر حد سے زیادہ اس سے تعلق خاطر رکھوں۔ اسی درمیان ان حکما میں سے ایک نے کہا: لیکن میری ایک رائے ہے..... یہ یاقوت کا جام اپنی تمام تر خوبصورتی اور قدر و قیمت کے باوجود، بادشاہ کے لیے دو بڑی مشکلیں پیدا کرنے کا باعث بھی ہے۔ پہلی مشکل یہ کہ اگر کوئی بادشاہ سے یہ جام چرا لے گا تو بادشاہ کو اپنی تہی دستی اور بے وقعتی کا احساس ہوگا۔ دوسری یہ کہ اگر بادشاہ جام کو کسی کو دے دے یا وہ گم ہوجائے، تو پوری عمر اسے افسردگی اور دلی پریشانی کا احساس رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ بادشاہ یاقوت کے اس جام سے دل نہ لگائے تاکہ اگر کہیں یہ جام اس کے ہاتھ سے نکل جائے تو وہ سکونِ دل سے محروم نہ ہو۔

بادشاہ روشن دل حکیم کے اس خیال اور گفتگو پر ہنسا اور اس کی بات کو اہمیت نہیں دی اور کہا: حکیم !یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔اگر کسی دن شاہی محل اور تاج و تخت گم ہو جائے، میرے ہاتھ سے نکل جائے تو پھر یاقوت کا یہ جام بھی نہیں رہے گا..... روم کے مغرور بادشاہ نے زندہ دل حکیم کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی اور یاقوت کے جام سے خوش وخرم رہا۔اب تک آپ نے روم کے بادشاہ کے جامِ یاقوت سے دلبستگی کا قصہ پڑھا۔

اب سنیے کہ ایک دن بادشاہ نے ایک جزیرے میں تفریح کا پروگرام بنایا۔

یہ جزیرہ روم کے قریب تھا۔بادشاہ جب بھی آرام کرنے کا ارادہ کرتا، وہاں چلا جاتا۔ بادشاہ اس جزیرے میں چلا گیا اور وہاں چند روز عیش وعشرت میں مشغول رہا۔اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ سب جاں نثار درباری، نوکر چاکر اور غلام اس کی خدمت میں حاضر ہوں اور بقول شخصے اس کی عیش وعشرت کی محفل کی رونق بڑھائیں۔

کچھ بھی وقت نہیں گذرا تھا کہ وہاں خوشی ومسرت کا بازار گرم ہوگیا۔اسی ماحول میں بادشاہ نے اپنے ایک نزدیکی شخص کو آواز دی اور اس کے کان میں کہا: تجھے معلوم بھی ہے کہ ہمارے اس جزیرے میں کس چیز کی کمی ہے۔جس کی وجہ سے ہمارا عیش وعشرت مکمل نہیں؟

درباری نے کچھ سوچا اور عرض کیا: حضور والا! مجھے تو اس جزیرے میں عیش و عشرت کا سارا ساز و سامان نظر آ رہا ہے۔ بادشاہ شوق کے عالم میں مسکرایا اور بولا: جانتا ہوں کہ تو اصل مسئلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔اس لیے توجہ سے سن کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ابھی اسی وقت قابل اعتبار درباریوں میں سے چند لوگوں کو محل کی طرف بھیجو کہ وہ یاقوت کا جام یہاں لے آئیں۔ میں اگر اسے اپنے پاس

نہیں پاتا تو مجھے بے آرامی اور افسردہ خاطری کا احساس ہوتا ہے۔

جی، بادشاہ کے حکم سے دربار کے چند جانے پہچانے لوگ اس پر مامور ہوئے کہ ملک کے خزانے سے یاقوت کا جام اٹھائیں اور کشتی پر سوار ہوکر جزیرے میں لے آئیں۔

درباریوں نے خوف و احتیاط سے جام اٹھایا، اسے ایک سنہری سینی پر رکھا، سینی کو ہاتھ پر رکھا اور کشتی پر سوار ہوگئے۔

کشتی پر سوار لوگ کچھ دیر تو ذہنی سکون و اطمینان سے رہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کنارے اور خشکی پر پہنچنے والے تھے کہ دفعتاً حالات نے پلٹا کھایا اور دریا جواب تک بھیڑ کے ایک بچے کی مانند ساکت و خاموش تھا، ایک دفعہ ہی طوفانی اور ناسازگاری و پریشانی کا باعث ہوگیا۔

دریا میں تلاطم کی وجہ سے، وہ کشتی جس میں یاقوت کا جام تھا، ایک پہاڑ جیسی موج پر سوار ہوگئی اور دفعتاً اِدھر اُدھر ہچکولے کھانے لگی۔

درباری اب یہ سوچ رہے تھے کہ یاقوت کا جام چوں کہ کشتی میں ہے اس لیے یہ بالکل ہلنی جلنی نہیں چاہیے۔ وہ اعتراض کرنے کی خاطر ناخدا کے پاس گئے اور کہا: ارے ناخدا! تجھے معلوم بھی ہے کہ اس کشتی میں کونسی گراں قیمت چیز بادشاہ کے لیے لے جائی جارہی ہے؟ اگر تو جانتا ہے تو پھر کچھ تو کر۔

دریا میں تلاطم کی حالت کی وجہ سے کشتی کے ناخدا کا آرام وسکون بھی برباد ہو چکا تھا۔ اس نے اسی حالت میں کہا: تم لوگ دریا کو پرسکون کردو، طوفان نہ آنے دو پھر میں بھی یہ کام کروں گا کہ بادشاہ کی امانت صحیح سالم اس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

ابھی ناخدا کی یہ باتیں جو غصے، پریشانی میں اور طعنے اور کنایتاً کررہا تھا، ختم

نہیں ہوئی تھیں کہ ایک اور کوہ پیکر موج کا حملہ ہوا۔اس بار اس موج نے کشتی کو دریا سے جدا کر دیا وہ ایک پرندے کی مانند ہوا میں اڑ رہی تھی۔

جیسے ہی کشتی ہوا میں اڑی اسی وقت اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

مختصر یہ کہ پلک جھپکتے میں نہ کشتی کا نام و نشان باقی رہا اور نہ اس کے سواروں کا۔طوفان، آشوب اور آشفتگی کے اس حال میں، اہل کشتی اور ساز و سامان دونوں کسی گوشے و کنار میں جا گرے۔ جو مسافر طاقتور و توانا تھے، جن کے بازوؤں میں جان تھی، وہ تختے کے ایک ٹکڑے پر چپک گئے تا کہ کسی طرح راہِ نجات حاصل کر سکیں اور جان بچانے کا راستہ پیدا کر سکیں۔

بالآخر جب شور و غل کم ہوا اور پانی بھی متلاطم نہ رہا، ان لوگوں میں سے ایک دو کے جو یاقوت کے جام کو بادشاہ کے محل سے جزیرے پر لانے کے ذمے دار تھے، ہوش ٹھکانے آئے۔انہوں نے دیکھا: اے دل نادان! جو کچھ بھی تھا نہ تھا، وہ سب دریا کی نذر ہو گیا۔اسی میں یاقوت کا جام بھی ہاتھ سے چلا گیا اور دریا کی تہ میں گم ہو گیا۔

یہ درباری کچھ دیر روتے دھوتے اور سر پیٹتے رہے۔ پھر وہ لرزتے کانپتے اور ڈرے سہمے کھڑے ہوئے اور اسی حالت میں کہ بادشاہ کے غصے سے خائف تھے، دربار کی طرف چل دیے تا کہ یاقوت کے جام کے گم ہو جانے کی اطلاع بادشاہ کو پہنچا دیں۔

بادشاہ جزیرے میں اپنے درباریوں اور حوالیوں، موالیوں کے ساتھ عیش و عشرت میں غرق تھا۔ بادشاہ نے سنا کہ موسم خراب ہو گیا ہے، دریا کے پانی میں طوفان آ گیا ہے اور اسی طوفان نے سب کچھ درہم برہم کر دیا ہے، لیکن صرف ایک چیز کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا اور وہ یاقوت کے جام کا کھو جانا تھا۔

وہ سرگرمی اور آرام سے یاقوت کے جام کی خوبصورتی اور اس کی جاذب نظر شکل وصورت کی باتیں کررہا تھا کہ دوخدمتگار جن کے ہاتھ سے جام دریا کی تہ میں غرق ہوگیا تھا، بری حالت میں، جن کے چہرے کا رنگ فق تھا، اور کمر جھک گئی تھی، بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور اس کے سامنے زمین پر گر پڑے۔

بادشاہ نے ان تازہ واردوں کا حال زار دیکھا اور سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ بری خبر ہے، اس کا خیال ہر طرف گیا لیکن یاقوت کے جام کی طرف مطلق نہیں گیا۔

اس وجہ سے وہ ان بدبختوں پر غصے سے چیخا: کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی آسمانی بلا زمین پر نازل ہوگئی ہے یا کسی دشمن نے ہماری قلمرو پر حملہ کردیا ہے؟

ان دو میں سے ایک نے نہایت رنج وافسوس کے ساتھ ایسے کہ اس کے سر پر گویا قہر ٹوٹا ہو، کہا: بادشاہ سلامت، میری جان آپ پر قربان، اے کاش ایسا ہی ہوا ہوتا، لیکن اس سے زیادہ بری بلا ہمارے سر پر نازل ہوئی ہے..... حضور والا یاقوت کا جام دریا میں گر پڑا ہے..... کشتی غرق ہوگئی اور جام بھی دریا کی تہ میں غرق ہوگیا۔

بادشاہ کو یہ گمان ہوا کہ یہ کوئی حیلہ بازی اور دھوکہ دھڑی کی بات ہے۔ وہ غصے ہوا۔ اپنے تخت سے نیچے اترا اور ان دونوں بے نواؤں کا گریبان پکڑلیا اور گرجا: جلدی بتاؤ تم نے یاقوت کے جام کا کیا کیا۔ میں تمہاری اس لفاظی سے دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔

لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنے وہی پہلے الفاظ دہرا رہے ہیں، تو پھر اسے آہستہ آہستہ یہ یقین ہوگیا کہ یاقوت کا جام چنگھاڑتی امواج کی غذا بن چکا ہے۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچا اور قصہ اس موڑ پر آیا، تو دفعتاً اس کی عیش و

عشرت کی مجلس عزاداروں کے مجمعے میں بدل گئی اور بادشاہ پر رنج وافسوس کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس سب کے باوجود، بادشاہ اب بھی یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ یاقوت کا جام جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔

اس وجہ سے اس نے حکم دیا کہ زبردست اور دلیر غوطہ خور جن کی زندگی سالہا سال مروارید کے شکار میں گذری ہے، دریا کی تہ میں جائیں، ممکن ہے وہ یاقوت کے جام کو ڈھونڈ سکیں۔ لیکن انہوں نے جتنا بھی ڈھونڈا اور وہ دریا کے حوادث سے جتنا بھی جوجھے، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا، بالآخر اس کے بعد بادشاہ جب تک زندہ رہا اسے کبھی خوشی اور راحت کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ اسے جب بھی یاقوت کا جام یاد آتا، افسردہ حال ہوجاتا، اس کا دل مرجاتا۔ ایسے اوقات میں کوئی یہ جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ اس سے کوئی بات کرے اور اس سے کچھ پوچھ سکے۔

جب حکایت اس مقام پر پہنچی تو افلاطون نے غمگین انسان کی طرف دیکھا اور کہا: بہت اچھے! اس حکایت کے نقل کرنے کے بعد تو سمجھ گیا ہوگا کہ بہت سی ایسی چیزوں سے جو ہماری زندگی میں موجود ہیں، بے حد وحساب دل بستگی کس طرح انسان کے لیے بجائے خوشی اور مسرت کے، افسردگی کا باعث ہوتی ہے۔ میں خود بھی اگر رنجیدہ وغمگین نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کسی چیز سے بھی دل بستگی پیدا نہیں کی ہے..... اب تو خود بتا، کیا واقعی دنیا میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس سے انسان اس قدر زیادہ تعلق خاطر پیدا کرے کہ اگر وہ اس کے ہاتھ سے چلی جائے تو وہ روم کے بادشاہ کی طرح کبیدہ خاطر ہوجائے؟ اس دل شکستہ انسان نے یہ باتیں سنیں اور اسے احساس ہوا کہ غم کا ایک بھاری بوجھ اس کے کندھوں

سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب وہ پریشان خیالی کا شکار نہیں بلکہ فارغ البال ہے۔

اس کے بعد حکیم افلاطون سے اس نے خدا حافظ کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔

اب چوں کہ وہ خوش حال تھا اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ اس کے لیے افسردگی اور بے قراری کا باعث ہوتی، وہ خوشی خوشی اور اطمینان سے اسی حال میں گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اب میری بیوی بچے میرا پرسکون چہرہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور تعجب کریں گے کہ کس طرح دفعتاً میں مکمل طور پر بدل گیا ہوں۔

اسی خیال میں گم تھا کہ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے جو کچھ گھر میں دیکھا، اس کی بنا پر وہ بہت متحیر اور متعجب ہوا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا شاید اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔

جی، اس کی بیوی اس قدر رنجیدہ اور پریشان تھی گویا زمین و آسمان کے دروازے اس کے لیے بلند کر دیے گئے ہوں۔

افلاطون کی گفتگو سے اس افسردہ دل شخص کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ اس نے جو گھر کا حال درہم برہم دیکھا تو بہت حیران ہوا، خاص طور پر اس لیے کہ باورچی خانے میں آگ نہیں جل رہی تھی اور اس کی بیوی نے ہانڈی نہیں چڑھائی تھیں۔ اس لیے اس نے بیوی کی طرف رخ کیا اور پوچھا: کیا خبر ہے؟ گھر میں اس قدر خاموشی کیوں ہے؟ باورچی خانے سے دھواں کیوں نہیں اٹھ رہا ہے؟ ابھی اس شخص کو اس کا جواب نہیں ملا تھا کہ ایک نیا دوسرا سوال اس کے ذہن میں آیا، بچے کہاں گئے؟ خدا نہ کرے ان کے سر پر کوئی بلا تو نازل نہیں ہو گئی۔ ان کی آواز کیوں نہیں آ رہی ہے!

اس کی بیوی اب تک خاموش ہی تھی۔ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا:

بچے تہہ خانے میں چلے گئے ہیں۔اس کو تعجب ہوا۔اس نے خود سے کہا: تہہ خانے میں چلے گئے ہیں؟ آخر اس گھر میں ہو کیا رہا ہے.....؟ بچے تہہ خانے میں چلے گئے ہیں تو میری بیوی اس قدر پریشان کیوں ہے؟

اس کے بعد کچھ اور کہنے سے پہلے وہ تہہ خانے کی طرف دوڑا۔بچے خوف و ہراس سے ایک کونے میں دبکے بیٹھے تھے۔ان کے شور وغل کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔انہوں نے جو اپنے والد کو دیکھا تو کچھ ہلے جلے۔

باپ اپنے بچوں کو تہہ خانے سے باہر لایا اور انہیں پیار سے کمرے میں لے گیا اور پھر پوچھا: کیا ہوا؟ تم آخر میری نظروں سے کیوں چھپے تھے؟ کیا کچھ اتفاق رونما ہوا ہے اور تم نے کوئی ایسا کام کیا ہے کہ مجھے اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے؟

بچوں نے جواب دینے کے بجائے، اپنی ماں کی طرف اشارہ کیا اور اس سے سارا معاملہ بیان کرنے کی درخواست کی۔وہ عورت کچھ کہنے میں تامل کررہی تھی۔اس نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف دیکھا، لیکن کہا کچھ نہیں۔وہ شخص اب بھی متوجہ نہیں ہوا کہ اس کی بیوی کیا کہنا چاہتی ہے۔لیکن جب اس کی بیوی نے کمرے کے گوشے کی طرف دوبارہ دیکھا، تب اس شخص کی سمجھ میں آیا کہ معاملہ کیا ہے۔

اس نے اب بچوں کو دیکھا اور پھر کمرے کے اسی گوشے کی طرف دیکھا اور کہا: اب میں سمجھا! تیرا مقصد یہ ہے کہ مٹی کا وہ گلدان جو مجھے بہت پسند تھا، اب موجود نہیں؟..... صحیح ہے کہ میں نے اپنے بچپن سے اب تک اس کی حفاظت کی تھی..... ہاں یہ درست ہے، اچھا اب مجھے وہ ٹوٹا ہوا گلدان دکھاؤ کہاں ہے؟

اب اس کی بیوی نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: ہاں ٹھیک ہے! میں نے

غفلت برتی اور بچے بھی کھیلنے میں مشغول تھے، انہوں نے گلدان پر کوئی چیز ماری اور اسے ٹوڑ دیا۔ گلدان کے ٹوٹنے میں ساری غلطی میری ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہم یہ چاہتے تھے کہ تو گھر میں ہمیشہ خوش وخرم رہے لیکن وہ کام جو ہم سے آج اتفاق سے سرزد ہوا ہے، اس کی وجہ سے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے تیری پریشانی کے اسباب فراہم کیے ہیں۔

جب اس شخص نے اپنی بیوی سے یہ باتیں سنیں تو وہ لاپروائی سے مسکرایا اور کہا: البتہ اس واقعہ کی وجہ سے میں رنجیدہ ہوا ہوں، جو بھی کچھ ہے، مٹی کا وہ گلدان مجھے میرے گذرے ہوئے زمانے کی یاد دلاتا تھا۔ کسی بھی چیز کی حفاظت میں غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے، لیکن جو کچھ ہو چکا وہ تو ہو چکا، اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کسی وقت میں ہی اس گلدان پر کچھ مار دیتا اور اسے ٹوڑ دیتا۔ جو کچھ بھی ہوا، اب یہ سمجھ لو کہ اس گلدان سے مجھے چنداں دل بستگی نہیں تھی۔

یہ بات سن کر، بچوں کی خوشی کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ عورت کو بھی اپنے شوہر کا یہ رویہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا: یہ سب کیا ہے؟ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ یہ سب کیسے ہوگیا؟ تو ایک دم اس قدر کیوں بدل گیا؟

اس شخص نے جواب دیا: میں بدل گیا؟ ٹھیک ہے، یہی تو تیری آرزو تھی، کیا تو خود مجھ سے ہمیشہ یہ نہیں کہتی تھی کہ میں کیوں اتنا غمگین اور مردہ دل ہوں، ہاں مجھے بھی چارۂ کار پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی..... بالآخر میں حکیم افلاطون کے پاس گیا اور اس سے اپنا دکھ درد کہا۔ حکیم نے بھی مجھ سے کہا کہ اگر مجھے پسند ہے کہ کبھی غمگین اور رنجیدہ خاطر نہ رہوں تو مجھے کسی بھی چیز سے دل بستگی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔

ہاں وہ شخص اس کے بعد زندگی کی تمام تر دشواریوں کے برداشت کرنے کے باوجود بھی، برسہا برس خوشی ومسرت سے زندہ رہا۔

تم بہت لمبے زمانے تک جیو

☆☆☆

کیمیاگر

برسوں پہلے قدیم زمانے میں، بالکل اسی دور میں جب عباسی خلفا بغداد میں حکومت کرتے تھے، ایک شخص اس شہر میں آیا۔

یہ شخص کیا کرتا تھا؟ اِدھر سے دھتکارا ہوا، اُدھر سے پھٹکارا ہوا۔

اس کا شغل کیا تھا، پیشہ کیا تھا؟ بیکاری اور مکاری۔

اب وہ بغداد میں کس مقصد سے داخل ہوا تھا؟ اصل قصہ یہی ہے۔

ایک بار..... یہ شخص جس کا سوائے فریب اور دھوکہ دھڑی کے اور کوئی کام نہیں تھا، بغداد میں آیا تا کہ کسی مفت ہاتھ لگے خزانے کا مالک بن جائے اور بغیر کسی زحمت و کوشش کے، بقول کسے اپنی دنیا آباد کرلے اور پھر اس شہر سے کہیں چلا جائے۔ یہ فریب کار بغداد میں کچھ مدت سیر و تفریح میں مشغول رہا تا کہ شہر کے حالات سے باخبر ہو جائے۔ یہ بھی سمجھ جائے کہ وہاں حقیقتاً کیا ہو رہا ہے اور وہاں کے حالات کیا ہیں۔

عاقبت کار چند دن کے بعد کہ بغداد میں خوب گھوما پھرا، لوگوں کے حالات اور خلیفہ کی آرزوؤں اور تمناؤں سے بھی واقف ہو گیا۔

وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ جس چیز نے مدتوں سے خلیفہ کے ذہن و دل کو اپنی

طرف راغب رکھا ہے، وہ کیمیا اور کیمیا گر سے اس کی دل بستگی ہے۔

دھوکے باز شخص جب خلیفہ کی اس آرزو سے واقف ہوا، تو بیٹھا اور ایک نقشہ تیار کیا تا کہ اس کے ذریعہ جلد سے جلد بے حد وحساب مال ومتاع کا مالک بن جائے۔

اس کے پاس کچھ سونا تھا۔ وہ یہ سونا ایک سنار کے پاس لے گیا۔ اس کو کچھ رقم دی اور کہا کہ وہ اس قیمتی دھات کو گرد کی شکل میں بدل دے، ایسے باریک کہ وہ بہ آسانی آنکھوں سے دیکھی نہ جاسکے۔

سنار نے وہ سونا لے لیا اور جیسا کہ اس فریب کار نے کہا تھا، سونا گرد میں بدل دیا۔

حیلہ گر نے وہ تھیلی اٹھائی جس میں سونے کی گرد رکھ دی گئی تھی۔ وہ تھیلی اپنے نیفے میں اڑسی اور وہاں سے چل پڑا تا کہ اپنے پلان کو مکمل شکل وصورت دے سکے۔

وہ چلتا رہا چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک شہر سے باہر ایک کھنڈر میں پہنچا۔

یہ دور افتادہ کھنڈر تھا جہاں سو سال سے کسی آدم زاد کے قدم نہیں پہنچے تھے۔

مختصر یہ کہ وہ فریب کار وہاں کچھ دیر رکا رہا اور حالات کا جائزہ لیا۔ جب وہ مطمئن ہوگیا کہ اب کسی طرف سے کوئی آنے والا نہیں۔ اس نے نرم مٹی کو کھال کے رنگ میں اور پھر سونے کے باریک برادے کو اس میں ملا دیا اس طرح اس نے مٹی کو گیلا کیا اور اس سے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنالیں فندق کے برابر۔

پھر اس نے مٹی کی گولیوں کو دھوپ میں رکھا اور صبر وحوصلے کے ساتھ دو تین دن اسی کھنڈر میں گذارے کہ گولیاں خشک ہوجائیں۔

جب گولیاں خشک ہوگئیں، انہیں ایک تھیلے میں ڈال لیا اور اپنی راہ لی۔

دوبارہ بغداد میں آ گیا، شہر میں عطاروں کی دوکانوں پر گیا۔ ان کے حالات کا جائزہ لیا۔ وہ کیا بیچتے ہیں، ان کے گاہک ان سے کیا مانگتے ہیں، ان سب چیزوں کی پوچھ تاچھ کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس نے شہر کے ایک عطار سے جو ایک سادہ لوح انسان تھا، دوستی کرلی۔

جب اسے اس عطار سے دوستی کا اطمینان ہوگیا، تو اس سے کہا: بھائی عطار! میں اپنے شہر سے ایک قسم کی دوائی لایا ہوں جو بہت سستی ہے، لیکن اگر کبھی اور کہیں کوئی طبیب اسے نسخے میں تجویز کردے تو اسے تو مریض کے ہاتھ بڑی قیمت پر بیچ سکتا ہے۔ اسی طرح تو مطمئن رہ کر اس شہر کی اگر تمام عطاروں کی دوکانوں پر بھی تلاش کی جائے تو اس جیسی اور اس قسم کی دوائی اسے کہیں نہیں ملے گی۔ اگر یقین نہیں آتا تو جا اور دریافت کرلے۔

سادہ دل عطار نے کہا: وہ دوائی مجھے دکھاؤ اور بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟

فریبی شخص نے مٹی کی گولیوں کی تھیلی اپنی انٹی سے نکالی اور عطار کے سامنے رکھ دی۔ اس کا منہ کھولا اور کہا: اس دوا کا نام تَبَر ہے۔ کیا تو نے اس کا نام پہلے سنا ہے؟ یاد رہے فقط تبر۔ جو بھی تیرے پاس آئے اور کہے کہ تبر نام کی دوا چاہیے، یہ دوائی اسے دے دینا۔ اگر اس کے بجائے کوئی اور طریقہ یہ دوائی بیچنے کا اختیار کیا تو پھر بے گناہ مریضوں کا خون تیری گردن پر ہوگا۔

عطار نے دوائی کی قیمت پوچھی۔ دھوکے باز نے عطار سے معمولی قیمت وصول کرلی اور وہاں سے چلا گیا۔ اور سادہ دل عطار کو دوائی کے بارے میں سوالوں کی ایک دنیا کے ساتھ تنہا چھوڑ گیا۔

خوشی اور مسرت سے حیلے گر کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ وہاں سے چلا گیا اور دارالخلافے میں داخل ہونے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرلیا۔

اب چوں کہ وہ وقت آ گیا تھا کہ اپنے اس دھوکے اور فریب کے جال سے فائدہ اٹھائے، جو اس نے بنایا تھا۔

دوسرے دن صبح، اس فریب کار نے اپنا بھیس بدلا، جو دیکھنے کے قابل تھا۔ پھولوں والا لباس پہنا اس نے کان کی لوؤں سے نکلتی ہوئی داڑھی اپنے لیے تیار کرلی تھی، بڑے جوتے پہن لیے تھے اور کچھ مہریں اور کوڑیاں اپنے چہرے اور گردن میں لٹکا لی تھیں۔ اپنی آنکھیں جلدی جلدی کھول بند کر رہا تھا۔ ایسی شکل و صورت میں وہ خلیفہ کے محل کے سامنے پہنچا۔ وہاں مامور لوگوں اور فوجیوں نے اس کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا اور دریافت کیا:

کیا کام ہے؟

اس نے جواب دیا: مجھے ابھی اسی وقت خلیفہ کی خدمت میں پہنچنا ہے۔ میرے دل میں ایک بات ہے جسے اگر ابھی اسی وقت خلیفہ کے سامنے نہیں کہوں گا تو پھر کسی وقت وہ مجھے یاد نہیں آئے گی۔ جلدی کرو، مجھے راستہ دو۔ اگر خلیفہ کو صورت حال کا علم ہوگیا اور وہ جان گیا کہ تم نے مجھے محل میں جانے نہیں دیا تو تمہاری تکہ بوٹی کردے گا۔

محل پر مامور لوگ دھوکے باز شخص کی باتیں سن کر حیران ہوئے۔ انہوں نے جلد ہی یہ معاملہ خلیفہ کے گوش گزار کردیا۔ خلیفہ نے بھی جو اس قسم کے کاموں سے دردسر میں مبتلا نہیں ہوتا تھا، حکم دیا کہ اس شخص کو اس کے حضور میں پیش کردیا جائے۔

فریبی خلیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ تعظیم بجالایا، محل کے ہال پر نظر ڈالی اور عرض کیا: محترم خلیفہ! یہ تمام سونا آپ کہاں سے لائے ہیں؟

خلیفہ اس بات سے ناخوش ہوا اور کہا: کیا بات ہوئی؟ کوئی شعر کہہ رہا؟ اس

محل میں کون سی جگہ سونے کی ہے؟

فریب کار ایک لمحے کے لیے خود میں کھوگیا اور پھر کہا: اچھا حضور والا! جیسا کہ آپ فرما رہے ہیں، اگر ایسا ہی ہے کہ یہاں سونا نہیں ہے تو میں حاضر ہوں تھوڑے ہی وقت میں اس محل کو سونے کے محل میں تبدیل کردوں۔

خلیفۂ بغداد ان باتوں سے رنجیدہ ہوا اور کہا: جلدی کر، یہاں سے دفع ہو، ہر روز ایک فریب کار راستے سے یہاں آجاتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ کیمیاگر ہے۔لیکن اس محل میں کچھ عرصے کھانے پینے کے بعد اور مجھ سے رقم اینٹھ کر، میرا دل خون کرنے کے بعد اپنے دھندے میں مشغول ہوجاتا ہے۔تو سمجھ لے اور آگاہ ہوجا کہ میرے کان اور آنکھیں اس نوعیت کی باتوں سے بھر چکے ہیں۔ جلدی کر یہاں سے چلتا بن ورنہ ابھی حکم دیتا ہوں کہ تیرا سر جسم سے الگ کردیں۔

فریبی نے کہا: حضور والا! اپنی بات اور دعوے کی ضمانت کے طور پر میں اپنی جان پیش کرتا ہوں۔آپ مجھے موقع تو دیں..... اگر میں اپنے دعوے کو صحیح ثابت نہ کروں تو دوسری بات ہے..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل کی صبح شام تک نہیں پہنچے گی، میں اپنی کیمیا اور آپ کی دیرینہ آرزوؤں کی کیمیا کو عملی جامہ پہنادوں گا، لیکن ایک شرط ہے کہ انگیٹھی، کنڈالی، آگ، قلم، پانی، کنڈالی، ہتوڑہ اور تنہائی آپ میرے پاس چھوڑدیں۔

ہوس کے مارے خلیفہ کی اس فریبی کی خود اعتمادی، سنجیدہ گفتگو اور پرسکون برتاؤ سے آتش شوق و ذوق بھڑک اٹھی، اس نے حکم دیا کہ وہ شخص جو کچھ چاہتا ہے اس کو مہیا و آمادہ کردیا جائے، حتیٰ اگر ان میں سے کوئی چیز بہ آسانی دستیاب نہ بھی ہوتی ہو۔

بالآخر نقلی کیمیا گر کے کام کے تمام وسائل مہیا کر دیے گئے۔ وہ اہل دربار کی آنکھوں سے دور، تہہ خانے میں اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

اس نے انگیٹھی جلائی اور کیمیا گری میں دل سے مشغول ہوا اور ایسا ظاہر کیا جیسے اپنے کام میں تن من سے مصروف ہے۔ دوسری طرف کبھی نہ پوری ہونے والی آرزوؤں نے دوبارہ سر اٹھایا۔ خلیفہ اپنے محل میں ٹہلنے اور اپنے چاروں طرف سونا ہی سونا دیکھنے لگا اور آرزو کرنے لگا کہ جس قدر ہو سکے جلدی کل کی شام آجائے اور وہ کیمیا گر کے رویے، کردار اور گفتار کا نتیجہ دیکھ سکے۔

ہاں گھنٹے کے بعد گھنٹہ آتا رہا اور گذرتا رہا، یہاں تک کہ دن تمام ہوا اور اندھیری شام نے زمین و زماں پر اپنی حکمرانی شروع کر دی۔

اس رات آرزومند خلیفہ پر کیا گذری، اس کا ذکر نہیں، جس وقت خورشید عالمتاب نے پر پیچ و تاب پہاڑوں کے پیچھے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنے نور کا سایہ اس کے سر اور چہرے پر ڈالا، وہ خوشی خوشی تہہ خانے کی طرف چلا کہ کیمیا گر کی خیر خبر لے۔ اس سے پوچھا: کیوں بھئی کس حال میں ہو؟ جس کیمیا کا کل تو نے وعدہ کیا تھا، اس کی کیا خیر خبر ہے؟

فریبی نے ایک نگاہ خلیفہ پر اور دوسری انگیٹھی پر ڈالی جو آگ سے سرخ ہو رہی تھی اور کہا: جناب خلیفہ! شام ہونے میں تو ابھی بہت وقت ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرا کام جلد ہی نتیجے پر پہنچ جائے گا اور میں کیمیا حاصل کرنے کی خوش خبری آپ کو دے دوں گا۔

خلیفہ شوق و ذوق سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے بے صبری سے کہا: ارے تو کس قدر سخت دل ہے! کس قدر سخت دل ہے! مجھے امید ہے کہ اس وقت تک میں زندہ رہوں گا اور تیری کوششوں کا ماحصل دیکھوں گا۔

خلیفہ نے یہ گفتگو کی اور دوبارہ محل میں چلا گیا۔ اس کی بھوک ختم ہوگئی تھی، بس ٹہلنے لگا۔

کچھ وقت اس نے اسی طرح گذارا، یہاں تک کہ ایک قاصد آیا اور اس نے اطلاع دی کہ کیمیاگر کو آپ سے کچھ کام ہے۔

خلیفہ بجلی کی تیزی سے اٹھا اور آنکھ جھپکتے ہی کیمیاگر کے پاس پہنچ گیا، لیکن پچھلی بار کے برخلاف جب کیمیاگر نے اسے دیکھا اور اس سے بات چیت کی، اس بار وہ سخت متفکر اور اپنے خیالات میں غرق تھا۔

خلیفہ نے پوچھا: کیمیاگر کیا ہوا، کیا کوئی نئی خبر ہے؟

وہ فریبی بغیر حرکت کیے دہکتی انگیٹھی کو ٹک ٹک دیکھتا رہا اور کہا: حضور والا! کیا آپ سونا دیکھ رہے ہیں؟

خلیفہ نے اپنی آنکھیں انگیٹھی اور اس میں شعلہ ور آگ پر گڑا دیں، لیکن جس قدر غور سے دیکھتا ہے سونے کا کوئی اتا پتا نہیں، اس وجہ سے اس نے پوچھا: ارے کیمیاگر! کیا تو نے سونا بنالیا ہے؟

کیمیاگر نے سر ہلایا اور خلیفہ پر متفکرانہ انداز میں گہری نگاہ ڈالی اور کہا: محترم خلیفہ! آپ نے اب تک سونا اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا، اگر اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے مامورین کو حکم دیجیے کہ شہر میں عطار کی دوکان سے میرے لیے ایک دوائی خرید لائیں، وہ جس قیمت پر بھی ہو۔

خلیفہ نے کہا: ٹھیک ہے! تو جلدی سے صرف اس دوا کا نام بتا، تا کہ میں حکم دوں کہ وہ دوائی تیرے لیے فراہم کردی جائے۔

فریب کار نے کہا: تَبَرَ

خلیفہ نے کہا: تَبَرَ؟ میں نے تو ابھی تک اس نام کی کسی دوائی کے بارے

میں کبھی کچھ نہیں سنا۔

فریبی نے جواب دیا: حضور والا! اگر کہیں آپ نے بھی تبر نام کی دوائی کے بارے میں سنا ہوتا تو کیمیاگری کا راز تو برملا ہو چکا ہوتا اور پھر میرا یہاں کیا کام ہوتا۔ آپ صرف اتنا نہ بھولیں کہ مامورین سے یہ کہیں کہ خلیفہ بیمار ہو گئے ہیں اور یہ دوائی ان کے علاج معالجے کے لیے درکار ہے تا کہ کوئی بھی کسی بھی طرح اصل معاملے سے مطلع نہ ہو سکے۔

خلیفہ نے وہاں کھڑے رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ جلدی سے ہال میں واپس آ گیا اور چند مخصوص خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ جتنی جلد ہو سکے دوائی کا بندوبست کریں۔

حکومت کے مامورین بس چل پڑے اور شہر میں عطاروں کی دوکانوں پر پہنچے۔ خلیفہ کے مامورین کو دیکھ کر عطار گھبرا گئے، زمین بوس ہوئے اور خلیفہ کی بیماری کے بارے میں پوچھنے لگے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ کوئی اس سے مشابہ دوائی دیں اور خلیفہ کی بیماری کا مداوا کریں۔ لیکن مامورین ان کے سوالات کا جواب نہیں دے رہے تھے، صرف تبر نام کی دوائی کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔

وہ جتنا بھی بھاگے دوڑے، تبر نام کی دوائی انہیں ملی نہیں۔

وہ تھکے ہارے سارے شہر میں چھان بین کرتے رہے اور اب وہ دوائی حاصل کرنے کی طرف سے ناامید ہو گئے تھے کہ اسی عطار کی دوکان پر پہنچے جس سے فریبی کیمیاگر نے پہلے ہی عہد و پیمان باندھ لیا تھا۔ عطار نے وہ نقلی دوائی ان کو دے دی اور مامورین سے بڑی قیمت وصول کر لی اور انہیں ہنستے ہنساتے بادشاہ کے محل کی طرف روانہ کر دیا۔ حکومت کے مامورین جلدی سے خلیفہ کی

خدمت میں پہنچے اور تبرنام کی دوائی کا تھیلا اسے پیش کر دیا۔ خلیفہ بھی فوراً اٹھا اور تہہ خانے میں اس نقلی کیمیاگر کے پاس گیا اور تھیلہ اس کے حوالے کر دیا۔

اس حیلہ گر نے تھیلے کا منہ کھولا۔ اس میں سے ایک خشک گولی نکالی۔ اس جھروکے تک گیا جس سے سورج کی کچھ روشنی تہہ خانے کے اندر آ رہی تھی۔

وہ جیسے یہ چاہتا تھا کہ دوائی کے صحیح سالم ہونے کی طرف سے اطمینان حاصل کر لے۔

جب یہ کام ختم ہو گیا، اس نے دوبارہ تھیلے میں ہاتھ ڈالا، پانچ، چھ گولیاں نکال لیں اور تہہ خانے میں چند مرتبہ چکر لگائے اور اس کے بعد اس نے خلیفہ اور اس کے چند حوالی موالیوں کو خاموش رہنے کی تاکید کی کہ اصلاً کوئی حرف زبان پر نہ لائیں۔

وہ اور خاص طور پر خلیفہ جو کیمیا دیکھنے کے منتظر تھے، خاموش ہو گئے اور اس نقلی کیمیاگر کی عجیب و غریب حرکتوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔

فریبی انگیٹھی کے نزدیک گیا۔ مٹی کی ان پانچ گولیوں کو سونگھا، کچھ دیر ان کو آگ پر دور سے گھمایا اور پھر انہیں کنڈالی میں ڈال دیا۔ جیسے ہی گولیاں اس کنڈالی میں ڈالی گئیں، تہہ خانے میں گرد و غبار کا ایسا طوفان آیا کہ بس سب دیکھتے ہی رہ گئے۔

وہاں ایسا گرد و غبار اٹھا کہ خلیفہ اور اس کے ہمراہی بری طرح کھانسنے لگے ان کے کھانسنے کی آواز تہہ خانے میں گونجنے لگی۔ آخر کار جب گرد و غبار بیٹھ گیا اور خلیفہ اور اس کے ہمراہیوں کو اس ناوقت کی کھانسی سے نجات مل گئی، اس فریبی نے ان سب سے کہا کہ نزدیک آئیں اور کنڈالی میں سونا دیکھ لیں۔

وہ بے خبر خلیفہ جو یہ سوچ رہا تھا کہ رونما ہونے والے حالات کو وہ خواب

میں دیکھ رہا ہے، آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کنڈالی میں آنکھیں گاڑ دیں۔ بالکل صحیح دیکھا کہ کنڈالی میں سونا نظر آ رہا تھا۔

سونا دیکھ کر خلیفہ خوشی سے چلایا اور اس نقلی کیمیاگر کو گلے لگالیا۔

دھوکے باز شخص دیکھ رہا تھا کہ یہاں تک اس کا پلان کامیابی سے ہم کنار رہا ہے۔ اس نے خلیفہ سے پرسکون رہنے کو کہا اور عرض کی: میں نے اب تک وہ کام جس کا وعدہ کیا تھا، انجام دے دیا ہے، مجھے اپنے علم اور ہنر پر سو فی صد اعتماد ہے لیکن پھر بھی ہر طرح سے اطمینان کے لیے، میں یہی کام کل بھی انجام دینا چاہتا ہوں تا کہ سونے کا محل بنانے کے ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

خلیفہ نے اس کی تجویز قبول کرلی اور فیصلہ کیا کہ کل پھر آئیں گے اور جھوٹے کیمیاگر کا کام کاج دیکھیں گے۔ اس طرح وہ اس کے حالات اور سونا بنانے کی ترکیب کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرلیں گے۔ سب نہیں جانتے لیکن آپ نے تو پورا قصہ پڑھا ہے، اس لیے بہتر جانتے ہیں کہ نقلی کیمیاگر کا یہ پلان بھی اس لیے تھا کہ وہ خلیفہ کو بہتر طور پر اور اچھی طرح اپنے جال میں پھنسالے۔

الغرض، دوسرا دن بھی نئی آب وتاب کے ساتھ آ پہنچا۔ خلیفہ اور اس کے ہمراہی بھی تہہ خانے میں پہنچ گئے تا کہ حیلے باز کی کیمیاگری کا تماشا دیکھیں اور لطف لیں..... کیمیاگری کا دعوے کرنے والے نے، اس مرتبہ نئی اداکاری سے وہی کام انجام دیا جو اس نے اس سے پہلے کیا تھا۔ اس نے خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کی حلقوں سے باہر نکلتی ہوئی آنکھوں کے سامنے نقلی کیمیا بنائی، انہیں دکھائی اور ان بیچاروں کے دلوں کو خوشی، ہیجان اور سرگرمی سے بھر دیا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی، جعل ساز خلیفہ کا ہمراہ اور ہم نشین بن گیا۔

کیا وجہ تھی اس کی؟ اس لیے کہ وہ حتی محل کے ستونوں کو بھی سونے کا بنا دینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

اس شخص نے خلیفہ کا لالچ اور ہوس اس حد تک دیکھی تو اس نے کہا: حضور کام تو کبھی ختم نہیں ہوتا، مخصوصاً اگر خلیفہ وہ کام کسی سے انجام دینے کو کہے، لیکن اجازت دیجیے کہ جب تک یہ محل پورے کا پورا سونے کا نہ بن جائے، میں خاموشی سے کام جاری رکھوں اور اس کے بعد ہی ہم دوسروں کو اس کی اطلاع دیں۔

دور دراز آرزوؤں کے سلسلے نے خلیفہ کے دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے تو جو بہتر سمجھے وہی کام انجام دے۔

دھوکے باز شخص نے اب پھر ایک لاکھ دینار مانگے۔ خلیفہ کی آنکھیں اور کان بند تھے۔ اس نے یہ رقم دینا منظور کر لیا تا کہ جس قدر ہو سکے جلدی اپنے محل کو سونے کا دیکھ سکے۔ لیکن کیا قصہ صرف یہی تھا؟ البتہ خلیفہ کی کبھی پوری نہ ہونے والی آرزوؤں اور خیالوں کے پس پردہ، کچھ اور ہی اتفاق رونما ہونے والا تھا۔

اگلا دن بھی ختم ہو گیا اور خلیفہ کی عمر کا ایک حصہ بھی بیت گیا۔ تب رات کی تنہائی میں دھوکے باز شخص نے رقم اٹھائی اور بظاہر کوئی کام انجام دینے کی خاطر اور حقیقت میں بغداد سے فرار ہونے کے لیے وہ محل سے باہر آیا اور پھر وہاں سے ایسا بھاگا کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے اگلے روز خلیفہ خوش و خرم نیند سے بیدار ہوا اور اپنے خیالوں میں گم کیمیاگر کی تلاش میں نکلا، لیکن اس کا کہیں اتا پتا نہ پایا۔

اس نے حکم دیا کہ اسے ہر جگہ تلاش کیا جائے اور اس کے نقش قدم تلاش کیے جائیں۔ لیکن جس طرح آپ نے اپنے کانوں کی پشت کبھی نہیں دیکھی، اسی طرح خلیفہ بھی اب اس نقلی کیمیاگر کو کبھی نہ دیکھ پائے گا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ پانی میں تبدیل اور زمین میں جذب ہو گیا ہے۔

اب خلیفہ کی سمجھ میں آیا کہ اس کے ساتھ کس قدر بڑا دھوکہ ہوا۔ اس نے حسرت سے آہ بھری اور حیرت سے انگلی دانتوں تلے دبالی۔

صحیح ہے اور بالکل درست کہ جو چیز اصلاً خلیفہ کے کام کی نہیں تھی، وہ یہی ندامت اور پشیمانی تھی۔ ہاں! اس حیلہ گر نے کتنا ہی ناپسندہ کام کیا، لیکن اکثر ہوتا ہے ایسا کہ لوگ ایسے ہی حیلہ گروں کے ہاتھوں اپنے نا قابل عمل خیالوں اور پوری نہ ہونے والی آرزوؤں کی وجہ سے مار کھاتے ہیں

بالکل اس خلیفہ کی طرح جو اس فریبی کے جال میں پھنسا اور اپنے محل کو سونے کی عمارت میں تبدیل کرنے کی آرزو کے ساتھ ہی قبر میں چلا گیا۔

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

☆☆☆

دو بھائیوں کا سفر

پہلے زمانے میں دور دراز ایک ملک وشہر میں ایک شخص رہتا تھا، اس دنیا میں ایک زمانے تک آبرومندانہ زندگی گذارنے کے بعد اس کی روح کا مرغ اس کے جسم کے پنجرے سے اڑ گیا اور اس کی عمر مل گئی آپ کو۔

اس بندۂ خدا کے دو لڑکے تھے، دو بلند وبالا سرو اور شمشاد کی دو شاخوں کی مانند۔

ہاں! اب وہ وقت آ گیا تھا کہ لڑکے اپنی آستینیں چڑھائیں، ہمت سے کام لیں اور کام ڈھونڈیں، زندگی گذاریں، اور بقول معروف پانی سے اپنی گلیم باہر نکالیں۔ بڑے لڑکے نے والد کا چھوڑا ہوا ورثہ لیا اور کام ڈھونڈنے اور کوئی پیشہ اختیار کرنے نکل گیا۔ اس نے اپنی زندگی کا تنور گرم کرلیا، لیکن دوسرے لڑکے نے بے شرمی، بے کاری اور کاہلی کو اپنا پیشہ بنایا۔ وہ سیدھا گیا اپنے بیہودہ دوستوں اور نااہل رفیقوں کے پاس۔ ہر روز صبح گھر سے باہر نکلتا اور رات گئے تک آوارہ گردی کرتا اور شہر کے گوشے گوشے میں مارا مارا پھرتا پھراتا تھکا ہارا جسم گھر گھسیٹ لاتا اور دوسرے دن پھر وہی کہانی۔

خلاصہ یہ کہ اس بے شرم وبے کار بھائی نے اپنے آپ کو نااہل دوستوں کی قید میں اتنا گرفتار کرلیا کہ جب آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ اب آہ کرنے سے کچھ نہیں

ہوگا، نالہ و بکا اب کسی کام کی نہیں۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو دوسرے نیک بھائی نے اس کی خیر و عافیت پوچھی اور اس سے کہا: ٹھیک ہے، یہ تو اس راستے پر چلنے کا نتیجہ نکلتا ہی تھا جو تو نے اختیار کرلیا تھا، اب جو کچھ سرمایہ تیرے پاس ہے، لاؤ اس کا حساب کتاب کرلیں۔

نااہل لڑکے کو یہ بات بری لگی، اس کے ابرو تن گئے اس نے کہا: یہ ایسی باتیں کرنے کا وقت ہے؟ اس کے بجائے کہ میری مدد کرے تو بھی میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہے۔

غیرت مند بھائی نے کہا: سچی بات یہ ہے کہ ایسی باتوں کا یہی وقت ہے چوں کہ جب تک تیرے پاس مال و دولت تھی، تو نے حق بات نہیں سنی۔ اب ایسے حالوں کو پہنچ کر پوچھتا ہے کہ کیا کروں؟ میں تیرے لیے کیا کرسکتا ہوں؟

وہ عیاش لڑکا بولا: جو مال و دولت تیرے پاس ہے اس میں سے کچھ مجھے دے دو تا کہ اس رقم سے میں بھی کوئی کام شروع کردوں، کوئی پیشہ اختیار کرلوں۔

اس بھائی کے دل میں جو اپنے غافل بھائی کے لیے سوائے خیر وصلاح کے اور کسی چیز کا طالب نہیں تھا، ان باتوں سے رحم کا جذبہ جاگ اٹھا۔ اس نے کچھ رقم اس کے سپرد کی اور کہا: لو! اس تھیلے میں ایک ہزار دینار ہیں، یہ پکڑو اور جاؤ کوئی کام کرو، لیکن شرط یہ ہے کہ اس بار عیش وعشرت میں گرفتار نہ ہوجانا۔ اپنی عقل سے کام لینا، دل سے نہیں۔

دوسرا بھائی راضی اور خوش ہوگیا اس نے رقم اٹھائی اور اپنی راہ لی، لیکن جیسے ہی اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بھائی کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے، اپنے انہی نابکار دوستوں میں گیا۔ عیش وعشرت اور آوارہ گردی کی بساط بچھائی۔ کچھ وقت

بعد جو اسے ہوش آیا تو پتا چلا کہ جو کچھ پاس تھا، ہوا ہوا، خرچ ہو گیا، اب وہ خود ہے اور اس کا خالی تھیلہ۔

جب یہ صورت حال ہوئی تو نیک بھائی نے پھر اس سے بات چیت کی اور کہا: کیا اب بھی کوئی ایسا کام باقی رہ گیا ہے جو تو نے اس شہر میں نہ کیا ہو؟ ہم نے برسوں اس شہر میں عزت و آبرو سے زندگی گزاری ہے۔ اس کے باوجود تو ہے کہ ڈھٹائی سے لوگوں کو ہم پر انگلیاں اٹھانے کا موقع فراہم کر رہا ہے؟ آخر میں تجھ سے کیسا برتاؤ کروں، کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ساری عمر اسی طرح گزار دے؟

نااہل بھائی نے اس بار پھر جو کچھ گزر چکا تھا اس پر اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا اور کہا: تو صحیح کہہ رہا ہے، میں تیری باتوں سے ہل گیا اور ہوش میں آ گیا ہوں۔ اب میرا قصد یہ ہے کہ صلاح و نیکی کا راستہ اختیار کروں، لیکن اس شرط پر کہ تو میرا ساتھ دے۔

نیک بھائی نے پوچھا: ٹھیک ہے، میں کیا کروں؟ آیا میں نے تیرے لیے وہ سب کچھ نہیں کیا جو میرے بس میں تھا؟ بے کار لڑکے نے اپنے بھائی سے کہا: تم سے کچھ چھپا نہیں، اس شہر میں جو اتفاقات رونما ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے مجھ میں یہاں کے لوگوں سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں، اب چوں کہ میں چاہتا ہوں کہ نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کروں تو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے اسے اٹھاؤ اور ہم دونوں اس شہر سے کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوسرے شہر میں کسی کام اور صنعت سے دل لگا لوں گا اور اس طرح ہم بھرے ہاتھوں اپنے شہر میں لوٹیں گے۔

نیک بھائی نے ان باتوں پر یقین کر لیا۔ اپنے بھائی کا شرمندہ چہرہ دیکھا اور اس کا دل موم ہو گیا۔ اس نے کہا: چلو ٹھیک ہے، حالاں کہ میں اب تک اس قسم

کے سفر پر نہیں گیا ہوں، لیکن تیری خاطر میں یہ کام بھی کروں گا، لیکن ایک شرط ہے کہ میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آ اور اپنے گذشتہ طور طریقوں کو ترک کردے۔ نااہل لڑکے نے سر ہلادیا اور ظاہراً یہ شرط قبول کرلی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ اس پر ہنسا اور کہا: اس بار ایسا کام کروں گا کہ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے تیری چوں و چرا سے مجھے راحت مل جائے گی اور عمر بھر آرام سے کھاؤں گا، پیوں گا، لٹاؤں گا اور ضائع کروں گا۔

دونوں بھائیوں نے سفر کا ساز و سامان کیا۔ گھوڑے خریدے اور ایک شخص کے ساتھ جس کا کام گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا تھا، سفر پر نکل گئے۔

انہوں نے ایک ہمراہی اس لیے اپنے ساتھ لیا تھا چوں کہ اب تک ایسے سفر پر نہیں گئے تھے۔

القصہ..... دونوں ہم سفر چلتے گئے، چلتے گئے۔

ایک دن، دو دن، تین دن سفر کیا۔ تھک گئے۔ اب فیصلہ کیا کہ کہیں ٹھہر جائیں اور لمبے راستے کی تھکن دور کریں اور پھر سے اپنا سفر جاری رکھیں۔

اپنی آرام گاہ پر انہوں نے اپنے گھوڑے ایک درخت کے تنے سے باندھے اور اس کے سائے میں لیٹ گئے۔ کچھ وقت گذرا۔ دوسرا بھائی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور کہا: اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنی سواریوں کی دیکھ بھال کریں، انہیں کھانا پانی دیں۔

گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے نے بھی اپنے آپ کو تیار کیا اور کہا: میں ابھی یہ کام شروع کرتا ہوں۔ جیسا کہ پانی کی آواز سے ظاہر ہے، یہاں کہیں نزدیک ہی کوئی چشمہ ہے۔ میں جاتا ہوں اور بے زبان جانوروں کے لیے اس چشمے سے مشک بھر کر لاتا ہوں۔

نااہل بھائی نے بیچ میں ٹانگ اڑائی اور کہا: جو کچھ بھی ہے، ہم ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے تجھے مزدوری پر رکھا ہے کہ ہماری سواریوں کی دیکھ بھال کرے، لیکن انصاف کا یہ تقاضا نہیں کہ اس حال اور سفر کی مشکلات میں ہم تجھے تنہا چھوڑ دیں۔ اس نے یہ کہا اور دو ایک مشکیں اٹھائیں اور اس شخص کے ساتھ چشمے کی طرف چل دیا۔

وہ اس پہاڑ سے گذرے جوان کے سامنے کھڑا تھا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ وہ نیک بھائی کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے دوسرا بھائی جس کے جسم میں شیطان گھس چکا تھا اور دنیا کے مال و دولت سے تعلق خاطر نے اس کی عقل کا چراغ بجھادیا تھا، سمجھ گیا کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنے پلان کو عملی جامہ پہنائے۔ اسی وجہ سے، اس سے پہلے کہ چشمے پر پہنچیں، اس بندۂ خدا سے پیچھے ہوگیا، پھر اس غافل پر جھپٹا، ہر طرف سے مکے برسائے اور اسے نیچے پھینک دیا۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے پہاڑ کے نیچے دیکھا اور جب اسے یہ اطمینان ہوگیا کہ اب اس بیچارے میں زندگی کی رمق بھی باقی نہیں، نیچے گیا اور چشمے سے دو مشکیں بھریں اور اسی درخت کے پاس آ گیا جس کے نیچے اس کا بھائی لیٹا آرام کر رہا تھا۔

نیک بھائی نے دیکھا کہ دو لوگ گئے تھے چشمے پر، اور ان میں سے صرف ایک لوٹا ہے، اس نے پوچھا: ارے وہ شخص کہاں ہے وہ کہاں گیا؟ مگر طے یہ نہیں تھا کہ وہ چشمے سے پانی لائے اور جانوروں کی دیکھ بھال کرے؟

نااہل بھائی نے پانی کی مشکیں ایک کنارے رکھیں، یہ ظاہر کرنے لگا جیسے راستے کی تھکن کی وجہ سے اس میں اب بات کرنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ بھائی کے پہلو میں لیٹ گیا اور پھر کہا: وہ بھی جلدی ہی چشمے سے لوٹ آئے گا، بہت

تھک گیا تھا اس لیے وہیں چشمے کے کنارے لیٹ گیا ہے تا کہ کچھ آرام کرے۔ میں نے بھی اسے منع نہیں کیا۔

نیک بھائی اب اسے اپنی ہی طرح سچا اور درست کار سمجھتا تھا۔اس نے کچھ نہیں کہا۔اسی طرح درخت کے نیچے لیٹا رہا۔حالاں کہ نااہل بھائی نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ سو رہا ہے، لیکن وہ چپکے چپکے اپنے ہم سفر اور اپنے ہی خون کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ کب سوتا ہے۔ بالآخر دو ایک بار ادھر ادھر کی کروٹ لینے کے بعد، خدا ترس بھائی کو نیند آ گئی۔اس کا نابکار بھائی پلک جھپکتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا، ایک رسی اٹھائی اور اپنے بیچارے بھائی کی زندگی کے درپے ہو گیا۔اس زبردستی سے اس کا بھائی جو سو رہا تھا، خوف و ہراس سے جاگ گیا۔اس کو اپنے بھائی کے اس کام سے تعجب ہوا، پھر بھی اس نے پوچھا: ارے یہ کیا کر رہا ہے؟ میرے ہاتھ پیر کیوں باندھ رہا ہے؟ کیا تیری عقل چرنے چلی گئی ہے؟

نااہل بھائی اپنے بھائی کے سامنے اب بے شرمی کرنے لگا تھا، ڈھٹائی سے بولا نہیں، میری عقل چرنے نہیں گئی، بلکہ میں وہی کام کر رہا ہوں جو ہر عقلمند انسان جو میری جگہ ہوتا، انجام دیتا، بس بہت ہوا، میں تجھ سے تھک گیا ہوں، اب مجھ میں طاقت نہیں کہ خود کو فقر و تنگدستی کا شکار دیکھوں اور تجھے ناز و نعم میں غرق، تیرا خیال تھا کہ میں تجھے اس کی اجازت دے دوں گا کہ تو ہمارے والد کی تمام مال و دولت کا مالک بن جائے اور میں پوری عمر تیرا دست نگر رہوں۔

خدا ترس بھائی نے جواب دیا: کیا عجیب و غریب باتیں کر رہا ہے؟ والد صاحب کی دولت سے جو کچھ تجھے ملا اسی مقدار میں مجھے بھی ملا ہے۔تجھ میں اور مجھ میں صرف اتنا فرق تھا کہ میری سمجھ میں آ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور تو بے کاری اور عارضی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔

نابکار لڑکے کی آنکھوں میں اب خون اتر آیا تھا۔ وہ اپنے بے گناہ بھائی کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا: دیکھ تو اب بھی زبان سے مجھے کچوکے دے رہا ہے۔ اتفاقاً میرے اس فیصلے میں کہ تجھے راستے سے ہٹادوں، ایک وجہ یہی ہے کہ تو مجھے زبان سے زخمی کرتا رہتا ہے۔

دونوں بھائیوں میں تکرار بڑھ گئی، تو تو میں میں ہونے لگی، نااہل بھائی بے گناہ بھائی کے ہاتھ پیر باندھنے کی جس قدر کوشش کر رہا تھا، وہ اتنا ہی زیادہ اس کے چنگل سے آزاد ہونے کی سعی کر رہا تھا۔

جب بات یہاں تک پہنچی، سنگ دل بھائی نے زمین پر سے کنکر پتھر اٹھائے اور اس بندۂ خدا کے سر اور چہرے پر اس قدر مارے کہ اسے بے حال کر دیا۔

اس کے بعد اس کے ہاتھ پیر خوب اچھی طرح باندھ دیے۔ اب وہ تیار تھا کہ خنجر سے اس بے چارے کی بچی کھچی جان بھی جسم سے نکال دے۔

خداترس بھائی نے کہا: یہ کیا ہے جو تو انجام دینا چاہتا ہے؟ آخر کیوں میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا چاہتا ہے، کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی نہیں۔ والد صاحب کی روح پاک کی قسم، میرے پاس جو کچھ ہے، وہ تجھے بخش دوں گا..... کیا میں نے اس سفر کی تکلیف صرف تیرے لیے برداشت نہیں کی، میں نے اس سے پہلے تجھے رقم نہیں دی تا کہ حلال روزی کمانے کے لیے تیرے پاس سرمایہ ہو، بلاوجہ اس دور دراز اجنبی سرزمین پر آخر کیوں میرا خون بہانا چاہتا ہے..... اس سب کے علاوہ، تجھے یہ خیال نہیں آ رہا ہے کہ اگر وہ شخص آ گیا، تیرے ساتھ کیسا معاملہ کرے گا؟

نااہل بھائی نے قہقہہ لگایا اور اسے بتایا: اس شخص کی زیادہ فکر مت کر، اس سے پہلے کہ تجھے اس طرح قید و بند میں ڈالوں، چشمے کے کنارے اس بد بخت

کا کام تمام کر چکا ہوں۔

اس مومن بھائی نے یہ خبر سن کر ایک جانسوز آہ بھری اور کہا: اس کے معنی ہیں کہ میں ایک ایسے بھائی کا ہم سفر ہوں جو بے گناہوں کا زمین پر لاپروائی سے خون بہادیتا ہے۔ اے کاش مجھے اپنے شہر و ملک میں موت آتی اور یہ معمولی رقم تجھ کو مل جاتی اور میں نے یہ بے نتیجہ سفر نہ کیا ہوتا۔

جاہل و غافل بھائی کے کان جیسے کچھ سن ہی نہیں رہے تھے۔ گویا وہ بہرہ ہوگیا تھا اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنی کمر کے نزدیک کیا کہ خنجر کو میان سے نکال سکے۔ ایسا ہی ہوا بھی، اس نے خنجر اتنی شدت اور زور سے میان سے نکالا کہ اس کی غفلت سے عریان خنجر کی تیز نوک خود اس کے سینے اور گردن میں بیٹھ گئی وہ ایک پتھر کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک طرف جا گرا۔ اس کا سارا جسم خون سے لت پت ہوگیا۔

نیک بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اس کا نادان بھائی خود اپنے ہی خون میں تڑپ رہا ہے۔ اس نے اٹھنا چاہا اور اس کی مدد کرنی چاہی، لیکن یہ سب کچھ اس کے بس سے باہر تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ پیر تو بندھے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے اس کے دل سے چیخ نکلی۔ اس نے مدد کے لیے پکارا، لیکن وہاں کون تھا جو سنتا۔ اس نے کوئی جواب نہیں سنا۔ جب ایسا ہوا تو نہایت دردمندی سے اس نے خدا سے مدد کی دعا کی اور اسی راستے پر آنکھیں گاڑ دیں جو بیابان کے آخر تک چلا گیا تھا، جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

دونوں بھائی کچھ دیر اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار رہے، اسی طرح وقت گزرتا گیا۔

وہ اس مدت میں بہت زیادہ روتا دھوتا رہا، فریاد کرتا رہا، اسے جب ہوش آیا تو دیکھا اس کا بھائی مر چکا ہے اور خود اس کے ہاتھ پاؤں رسی میں جکڑے

ہوئے ہیں، اس وجہ سے وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اسی حال میں گرفتار تھا کہ اس نے خدا سے پھر دعا کی اور عرض کیا: اے مصیبت میں گرفتاروں کی مدد کرنے والے اور اے دونوں جہاں کے پالن ہار! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے اپنے بھائی کو تباہی اور بیچارگی سے نجات دلانے کے لیے، یہ سفر اختیار کیا تھا ورنہ خود اپنے شہر اور وطن میں آرام و راحت کی زندگی گزار رہا تھا۔ چوں کہ میں نے کارخیر کے لیے سفر کی پریشانی مول لی تھی، تو اس پہاڑی علاقے اور لق ودق بیابان میں، میری مدد کر، مجھے نجات دلا۔

یہ کہنے کے بعد وہ اس قدر زار و قطار رونے لگا کہ اسے دیکھ کر پتھر کا دل بھی تڑپ اٹھا۔ صالح لڑکے نے کچھ دیر اسی عالم میں گزاری۔ وہ خواب و بیداری کے درمیان میں تھا کہ اس نے اونٹوں اور جانوروں کی آواز سنی۔

اس نے سوچا یہ اس کا وہم ہے اور آوازیں اس نے خواب میں سنی ہوں گی، لیکن جب اس نے کان لگا کر سنا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ درست ہے آواز آرہی ہے اور کوئی کارواں یہیں کہیں آس پاس سے گزر رہا ہے۔

اس وجہ سے وہ اپنی پوری طاقت سے چیخنے لگا، ایک بار، دوبار، تین بار، لیکن کوئی جواب نہیں سنا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: یہ کیسے ممکن ہے۔ اہل کارواں نے لازمی طور پر میری آواز سن لی ہوگی، لیکن وہ جان بوجھ کر بہرے بنے ہوئے ہیں۔ کہتے ہوں گے کہ کسی کے پھٹے میں کیوں ٹانگ اڑائیں، سر میں درد نہیں تو رومال کیوں باندھیں؟ کیوں ایسے شخص کو اپنے ساتھ لے چلیں جو بعد میں دردسر کا باعث ہو؟

ابھی وہ اسی اڈھیڑ بن میں تھا کہ اتفاقاً دیکھا کہ اس کے گھوڑے جن کی لگامیں درخت کے تنے سے بندھی ہوئی تھیں، اچھل کود رہے ہیں، زور لگا رہے ہیں کہ رسّی توڑ کر وہاں سے بھاگ جائیں۔

جب اس نے یہ صورت حال دیکھی تو ان کی طرف رخ کیا اور چیخا: تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں کس حال میں گرفتار ہوں؟ اگر تم بھی بھاگ جانا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ، لیکن جب میں اپنے ہاتھ پیر کی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہوں گا تو پھر یہاں سے کس طرح جاؤں گا؟ لیکن جانور جو کچھ سن نہیں رہے تھے، اس کی یہی بات تھی۔

وہ چوں کہ آشفتہ اور پریشان ہو چکے تھے، انہوں نے اتنا زور لگایا، اتنے ہاتھ پیر مارے، اپنی رسیاں اتنی کھینچیں کہ درخت کی قید سے رہا ہو گئے اور اس مصیبت زدہ کے لیے امید کی کوئی کرن چھوڑے بغیر، انہوں نے اس بیابان میں دوڑنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف، اہل کارواں ہر طرف سے بے فکر و بے خبر تھے۔ انہوں نے اچانک ایسے گھوڑوں اور اونٹوں کے پیروں کی آواز سنی جو بجلی کی رفتار سے دوڑتے گرد و غبار اڑاتے ان کے نزدیک آ رہے تھے۔

ان کے سموں کی آواز اور چلانے کے شور کی وجہ سے اہل کاروان خوف و وحشت میں پڑ گئے۔ انہوں نے قافلہ سالار کے حکم سے، اپنا راستہ بدل دیا تا کہ چوروں اچکوں کے شر سے جو گویا کہیں نزدیک ہی گھات لگائے بیٹھے تھے، محفوظ رہیں۔ وہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں سمیت اطراف کے ٹیلوں کے پیچھے چھپ گئے۔ اہل کارواں نے کچھ دیر اسی خوف و دہشت میں گذاری، لیکن وہاں نہ کوئی آنا تھا نہ آیا اور نا ہی لوگوں کی آواز سنی اور نہ ہی سورج کی روشنی میں چمکتی تلواریں دیکھیں۔

اس وجہ سے وہ اب اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلے اور ان جانوروں کو دیکھنے لگے جو کسی مالک کے بغیر بیابان میں سرگرداں تھے۔

اہل قافلہ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ انہوں نے کاروان سالار سے اس صورت حال کی وضاحت چاہی۔

کاروان سالار نے اب راحت کی سانس لی اور اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ راستے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس نے کہا: یہ جانور ہمارے گھوڑوں اور اونٹوں کی آواز سن کر ادھر آ گئے ہیں اور شاید ان کا کوئی مالک ہے بھی نہیں۔ یہ اچھا نہیں کہ ہم انہیں ان کے حال پر اسی طرح چھوڑ دیں۔ انہیں پکڑ لینا چاہیے اور اپنے ساتھ لے جانا چاہیے۔ اگر ان کا کوئی مالک ہے اور وہ کہیں مل گیا تو فبہا، ورنہ اگر یہ اسی طرح آزاد گھومتے رہے تو ممکن ہے چور اچکوں کے ہاتھ لگ جائیں۔

قافلہ سالار کی اس گفتگو کے بعد، دو تین سوار ان گھوڑوں کے پیچھے ہو لیے تاکہ انہیں پکڑ لیں اور اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن گھوڑوں نے اپنا راستہ بدل دیا اور اسی طرف دوڑنے لگے جہاں دوسرا بھائی رسی میں چکڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔

سوار بھی ان جانوروں کے ساتھ چل دیے۔ انہوں نے اتفاق سے ایک شخص کو خنجر ہاتھ میں لیے مردہ دیکھا اور دوسرے شخص کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں لت پت ہے اور ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ انہیں یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیرت و تعجب ہوا۔

ایک سوار نے کہا: میرا خیال ہے کہ ہم جادوگروں کی سرزمین میں داخل ہوگئے ہیں کہ پے در پے عجیب و غریب چیزیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

اب وہ دوسرا بھائی بول اٹھا: نہیں، نہیں، یہاں کوئی سحر و جادو نہیں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس طرف کیسے نکل آئے، کیا تم نے مدد مانگنے کی میری آواز سن لی تھی؟

ایک دوسرے سوار نے بتایا کہ انہوں نے کس طرح جانوروں کو دیکھا اور ان کے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گئے۔ اس نے پھر کہا: ہم تو خانۂ خدا کے زائرین کے

کاروان میں ہیں۔ اس طرف سے گزر رہے تھے، ہم نے کسی آدمی زاد کی آواز نہیں سنی۔

نیک بھائی نے جب یہ باتیں سنیں، تو خوشی و شادمانی سے خدا کا نام لینا شروع کردیا اور کہا: بس تو یہ تمام اتفاقات اور جو کچھ پیش آیا، خدا کا لطف و کرم تھا کہ میں اس قید و بند سے نجات حاصل کرلوں۔

اس کے بعد اس نے جو کچھ اسے پیش آیا تھا، ان سواروں کو سنا دیا۔

سواروں نے اسے رسیوں کی قید سے آزاد کیا۔ اس کے گمراہ بھائی اور بے گناہ سائیس کے جنازے سپرد خاک کیے اور پھر اس نیک بھائی کے ہمراہ انہوں نے اپنی راہ لی۔

نیک بھائی اب خداوند عالم کے لطف و کرم سے مشکلات سے نجات پا چکا تھا۔ وہ بھی خوشی خوشی کاروان کے ساتھ چل پڑا تا کہ جس قدر جلدی ہو سکے خدا کے گھر پہنچ جائے اور خدا کی طرف سے ہونے والی مدد و اعانت کا شکریہ بجالا سکے۔

ہاں..... قصہ گو اور افسانہ پرداز کہتے ہیں کہ اس تمام حکایت پردازی کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے مسلمان بھائی کے لیے جال بچھاتا ہے، وہ خود اس کا شکار ہوتا ہے، اگر کوئی دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔

ان شاء اللہ جب تک ہماری عمر وفا کرے گی ہم اپنے ایمانی بھائیوں کے لیے سوائے نیکی اور خیر خواہی کے کچھ اور نہیں سوچیں گے اور وہ بھی ہمارے لیے سوائے بھلائی اور نیکی کے کچھ اور نہیں چاہیں گے۔

☆☆☆

یاقوت کی تھیلی

برسوں پہلے، قدیم زمانے میں مشرق کی سرزمین پر ایک شہر میں ایک شخص رہتا تھا۔ تاجر جو اشیا وہاں لاتا، انہیں فروخت کرتا اور اپنی روزی روٹی کماتا تھا۔ اسی باعث تاجر اور اشیا کے اس فروخت کرنے والے میں دوستی بھی گہری ہوگئی تھی چوں کہ دونوں کے وجود کے بغیر ایک دوسرے کی زندگی گذرنی مشکل تھی۔

تاجر جب بھی اپنے ملک سے شہر میں آتا، وہ سب سے پہلے اسی دوکاندار کو تلاش کرتا جس کا ذکر خیر ابھی ہوا۔ وہ وسایل زندگی، کپڑے اور دوسری چیزیں اس دوکاندار کو دے دیتا۔ اس کے بعد اگر کوئی سامان بچتا تو وہ دوسروں کے لیے لے جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اب شہر کے لوگ سامان خریدنے کے لیے اس بندۂ خدا کی تلاش میں آتے تھے۔ ایک دن دوکاندار نے تاجر سے کہا: اگر میں اور تو ایک دوسرے سے نہ ملتے، ایک دسرے سے آشنا نہ ہوتے تو معلوم نہیں میری زندگی کس طرح گذرتی۔ آخر اس شہر کے سب لوگ مجھے انہی چیزوں سے پہچانتے ہیں جو تو دوسرے ملک سے لاتا ہے۔ تاجر نے کہا: بہر حال اگر تو نہ ہوتا، میری زندگی بھی نہ گذر پاتی..... یہ سب وسیلے ہیں۔ سمجھ لو اور جان لو کہ روزی دینے والا تو

کوئی دوسرا ہی ہے۔

بالآخر یہی حال واحوال تھے۔وقت اسی طرح گذر رہا تھا کہ اچانک تاجر جو سال میں کم از کم ایک بار شہر آتا تھا، اب اس طرف نہیں آیا۔

ایک دن گذرا دوسرا دن، تیسرا دن، ایک ہفتہ اور دو ہفتے بیت گئے۔ دوکاندار جس کی دوکان ان پسندیدہ چیزوں سے ہر روز خالی سے خالی تر ہوتی جارہی تھی، جوں جوں وقت گذرتا جاتا، اپنے بیشتر گاہکوں سے بھی محروم ہوتا جارہا تھا۔آخر کار اس کا کام اس درجے پر پہنچ گیا کہ وہ مجبور ہوگیا اپنی دوکان کے لیے سامان خریدنے کے لیے قرض لے اور پیسے چکانے کے وعدے کرے۔

اس نے یہی کام کیا بھی چوں کہ شہر کے لوگ اس تاجر کی لائی ہوئی پسندیدہ چیزیں اس دوکاندار سے خریدا کرتے تھے، ان نئی چیزوں سے جو دوکاندار لا رہا تھا، خوش نہیں تھے۔اب وہ بھی متوجہ ہوا اور خود سے کہا: اے دل غافل! نہ صرف یہ کہ تیرا کاروبار اب بارونق نہیں بلکہ قرض کی رقم بہت زیادہ ہوگئی ہے اور طلب گار ہر گھڑی آجاتے ہیں اور اپنی رقم کا تقاضا کرتے ہیں۔

جب دوکاندار نے یہ حالت دیکھی، اس نے اپنی دوکان بند کردی اور چند روز اپنے گھر میں چھپا بیٹھا رہا تا کہ کوئی راہ نکلے وہ کچھ رقم کا بندوبست کرسکے اور قرض خواہوں سے شرمندگی اور ان کے احسان کے بار سے نکل سکے۔لیکن نہ حالات اچھے ہونے تھے نہ ہوئے۔

بالآخر دو تین دن وہ گھر میں رہا، حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، وہ ٹوٹ چکا تھا۔اس نے خود سے کہا: ٹھیک، اگر میں اسی طرح گھر میں بیٹھا رہوں اور انتظار کروں، تو نہ مجھے کچھ حاصل ہوگا اور نہ مجھے قرار آئے گا۔کیا یہ ممکن ہے کہ تنہا رہوں اور گھر میں اکیلا سڑتا رہوں۔بس مجھے کھڑا ہوجانا چاہیے اور گھر سے

باہر جانا چاہیے۔ممکن ہے اس طرح میرے کاموں میں پڑی ہوئی گرہ کھل جائے۔

دوکاندار نے خود سے یہی قول وقرار کرلیا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ خود اپنے سائے سے بھی ڈر رہا تھا، پریشان تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی قرض خواہ نہ نکل آئے۔ وہ چلتا رہا اور ایک کے بعد ایک شہر کے محلوں اور گلیوں سے گزرتا رہا۔تلاش میں رہا کہ اسے کوئی تو ایسا ملے کہ اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ لیکن اب شہر میں کوئی ایسا نہیں بچا تھا جس کے سامنے وہ شرمندہ نہ ہو چکا ہو۔

ہاں..... قضا را اس دن موسم بھی بہت گرم تھا اور سورج نے تنور کی مانند زمین اور ماحول کو خوب گرم کر دیا تھا۔ وہ دوکاندار اسی حال میں ناامید اور اپنے خیالات میں گم چلا جارہا تھا۔ وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا جو شہر کے باہر بہتا تھا۔اس نے ٹھنڈا پانی دیکھا جو آنکھوں کے اشکوں کی مانند صاف و شفاف اور چمکدار تھا، اس نے خود سے کہا: آج اتنے چلنے پھرنے اور تھکن کے باوجود کوئی چیز میرے ہاتھ نہیں لگی۔اب کم از کم غسل ہی کرلوں۔اس طرح راستے کی یہ گرمی اور تھکن ہی جسم سے رفع ہوجائے گی۔

اس نے ایک گوشہ تنہائی کا ڈھونڈلیا اور اپنے جسم کو ٹھنڈے پانی کے سپرد کردیا۔ کچھ دیر اس دریا کے پانی میں تیرتا رہا۔اس کی حالت کچھ بدلی۔ٹھیک اسی وقت جب وہ پانی سے باہر آنا چاہتا تھا، اس نے محسوس کیا کہ ایک رسّی اس کے پیر کی انگلی میں اٹک گئی ہے۔ پہلے اس نے کوئی اہمیت نہیں دی، لیکن وہ رسّی اس کے پیروں کی انگلی سے الگ نہیں ہوئی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو دوکاندار پریشان ہوگیا اور اس نے زور سے اپنا پیر کھینچا تا کہ اس چیز سے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا، خود کو رہا کرسکے۔اسی عالم میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز ہے جو اس کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح پر آرہی ہے۔

پہلے تو وہ ڈرا اور سوچا کہ کہیں کوئی جانور یا کیڑا تو اس کے پیر میں نہیں چپک گیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پانی سے باہر آ گیا اور خشکی میں آ کر اس نے اپنا پیر دیکھا۔ اسے معلوم ہوا کہ جو کچھ اس کے پیر میں چپکا ہے، کچھ نہیں بلکہ چمڑے کے تھیلے کا ایک بندھن ہے جس کے ساتھ خود تھیلا بھی گھسٹ کر پانی سے باہر آ گیا ہے۔ اس حالت میں گرفتار اس شخص نے جب یہ معاملہ دیکھا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے دور نکل آیا، تھیلے کو اٹھایا۔ ایک کونے میں لے گیا۔ اس کا بندھن کھولا۔ جو کچھ اس میں تھا۔ اسے دیکھ کر اس کا دل اچانک خوشی اور مسرت سے بھر گیا۔ ہاں تھیلے میں صدہا دینار اور ایک قیمتی پتھر تھا۔

دوکاندار کی زندگی کی حالت درہم برہم تھی، اس نے اپنے آپ سے کہا: چلو اب رنج و پریشانی کا دور ختم ہوا۔ اس میں جو قیمتی پتھر ہے، اسے اب فروخت کردوں گا اور صدہا دینار پاس ہونے کی وجہ سے میں ایک بڑا سرمایہ دار ہو جاؤں گا۔

دوکاندار اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ گھر پہنچ گیا۔

اس کی بیوی بچوں نے گھر کی خوشحالی کے اسباب دیکھے تو خوش ہوئے۔ اسی درمیان اس کی بیوی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا: یہ جو تو آئندہ کے لیے ساز و سامان کی بات کر رہا ہے، کس کے پیسے کے بل بوتے پر؟ یہ تیرا مال تو ہے نہیں۔ تو کس طرح غیر کے روپے پیسے اور مال سے اپنی زندگی کو اچھا رنگ و روپ دے سکتا ہے؟

جب اس شخص نے اپنی بیوی سے یہ بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا اور کچھ جواب نہیں دے سکا۔ اس کے دوسرے دن گھر سے باہر گیا تا کہ چمڑے کے اس تھیلے کے اصلی مالک کو ڈھونڈ سکے اور حق کو اس کے حقدار تک پہنچا سکے۔ وہ جتنا بھی گھوما پھرا، لیکن تھیلے کا مالک اسے نہیں ملا۔

آخر کار دو تین دن یہ دروازہ کھٹکھٹاتے اور اُس دروازے پر آواز دینے کے بعد، اس نے اپنی بیوی سے کہا: بھاگوان! معلوم ہے معاملہ کیا ہے؟ اب اس دولت کا مالک تو ملا نہیں..... اور مجھے کسی بھی دوسرے سے زیادہ اس مال کی ضرورت ہے، سو ایک کام کرتے ہیں..... اس میں جو ایک قیمتی پتھر ہے، اسے تو ہاتھ نہیں لگاتے، یہ حد سے زیادہ ہو جائے گا، لیکن نقد پیسہ جو ہزار دینار کے قریب ہے، قرض کے طور پر نکال لیتے ہیں، جب بھی اس کا مالک مل جائے گا، اس کو لوٹا دیں گے۔

عورت نے جب اپنے شوہر سے یہ باتیں سنیں تو خاموش ہوگئی۔

دوکاندار نے بھی تھیلے میں سے ایک ہزار دینار نکال لیے تا کہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے خود کو آزاد کر سکے، اور اپنی زندگی کے کاروبار کو بھی ترقی دے سکے۔

اس کے بعد، اس دوکاندار کی زندگی پٹری پر آ گئی اور بالآخر جس طرح بھی ہوسکا، وہ اپنی زندگی کو رونق دینے میں کامیاب ہوسکا۔

وہ اسی طرح اپنی زندگی کے دن رات گذار رہا تھا کہ ایک سال، دو سال ،تین سال اسی طرح گذر گئے۔ کس طرح؟ اس طرح جیسے بیچارے دوسروں کی عمر گزرتی ہے۔

القصہ..... ایک رات کسی کام سے وہ اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا، اور رات کو دیر سے گھر لوٹا۔ اس کی بیوی نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: کیا تو نے اس شخص کو اپنے راستے میں نہیں دیکھا؟ دوکاندار نے تعجب سے پوچھا کون سا شخص؟

عورت نے جواب دیا: وہ شخص جس کی ظاہری حالت بڑی خستہ تھی، پرانے اور پیوند لگے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور بیماری اور کمزوری سے اس کا رنگ ہلدی

جیسا پیلا پڑ گیا تھا۔

وہ شخص فکر میں پڑ گیا اور کہا: جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، نہ میں کسی ایسے شخص کو جانتا ہوں اور نہ میں نے اب تک اس کا نام ہی سنا ہے۔

دوکاندار کی بیوی نے پوچھا: تو کیسے اسے نہیں پہچانتا، جب کہ وہ بے نوا شخص تجھے تیرے نام و پتے سے جانتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ تیرا ایک دوست ہے۔

دوکاندار اور بھی فکر میں پڑ گیا اور کہا: میری عقل تو بالکل کام نہیں کر رہی ہے..... شاید وہ شخص حقیقتاً کوئی چور یا دھوکے باز رہا ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ جیسا تو کہتی ہے، وہ مجھے پہچانتا تھا، تو وہ اس وقت کیوں میری تلاش میں نہیں آتا جب میں دوکان پر ہوں اور اپنا کاروبار کر رہا ہوتا ہوں؟

عورت نے کہا: ٹھیک کہا تو نے۔ ممکن ہے وہ شخص خود کسی چور یا فریبی کے جال میں پھنسا ہوا ہو۔ اس نے مجھ سے کوئی چیز طلب نہیں کی۔ اور نہ کچھ کہا نہ سنا کہ وہ مجھ سے کسی چیز کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تجھ سے ملاقات کرے اور بس۔

دوکاندار نے پھر غور کیا اور جواب دیا: ٹھیک ہے، اگر وہ پھر سے میری تلاش میں آئے تو اس سے کہنا کہ وہ میری دوکان پر آئے تا کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے کہے۔

اس واقعہ کے بعد، اگلے دن وہ ناآشنا پھر دوکاندار کی تلاش میں آیا اور اس کے گھر کے سامنے اس کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ جب دوکاندار کی بیوی نے اس سے کہا کہ وہ دوکان پر چلا جائے اور اس کے شوہر سے ملاقات کر لے تو وہ دکھی اور پریشان ہوا اور اس کے گھر سے چلا گیا۔

ہاں کام کاج کی فکر اور اس اجنبی شخص کے بار بار آنے جانے سے جو ایک

سایے کے مانند اس کا پیچھا کر رہا تھا، اس بندۂ خدا کی زندگی کا چین و آرام رفو چکر ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ہر اس گاہک کو جسے وہ پہلی بار دیکھتا، یہی خیال کرتا کہ وہی خستہ حالت شخص ہے جس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے۔

اس واقعہ کو پیش آئے دو تین دن گذر گئے۔ دوکاندار اپنی دوکان پر کام کاج میں مصروف تھا۔ اس نے اچانک دیکھا کہ ایک بیچارہ اور بے نوا انسان جس کے ظاہر سے فلاکت وفقر ٹپک رہا تھا، اس کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے، لرز رہا ہے اور اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

دوکاندار نے یہ سوچا کہ یہ شخص فقیر اور پریشان حال ہے، اس لیے اس نے گلّے میں سے ایک سکہ نکالا اور اسے دے دیا۔ اس پریشان حاصل نے سکہ لے لیا اور دوکان میں اندر چھلانگ لگادی اور پھر جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔

دوکاندار اس صورت حال سے دنگ رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔ اس لیے اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اور بقول معروف قصے کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی دوکان اپنے ایک ہمسایے کے سپرد کی۔ دوڑا کہ اس اجنبی کا پیچھا کرے اور سمجھ لے کہ وہ کیا کرتا ہے اور اس سے کیا چاہتا ہے۔

دوکاندار پیچھے پیچھے اور وہ اجنبی آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اجنبی ایک سنسان گلی میں جا کر کھڑا ہوگیا۔

دوکاندار آگے بڑھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: بندۂ خدا، بتا تو کون ہے اور مجھ سے کیا کام ہے؟ کیا وہ تو ہی نہیں جو چند روز سے میری تلاش میں ہے؟

وہ پریشان حال اب تک دیوار کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ وہ یکا یک پلٹا اور

دوکاندار پر نگاہ ڈالی اور کہا: مجھے اچھی طرح دیکھ، کیا تو مجھے نہیں پہچانتا؟

دوکاندار نے اس کو حیرت سے دیکھا اور پھڑک گیا۔ یہ پریشان حال کوئی دوسرا نہیں، وہی تاجر ہے کہ جسے وہ برسوں سے پہچانتا ہے اور دونوں میں دوستی اور رفاقت رہی ہے۔

دوکاندار نے جب یہ حال دیکھا تو اس نے آج کے اِس آفت زدہ اور کل کے تاجر کے گلے میں جلدی سے بانہیں ڈال دیں اور دونوں کچھ دیر زار و قطار روتے رہے۔

دوکاندار رنج والم میں اپنی جگہ سن کھڑا رہا۔ اس سنسان گلی میں ایک گھر کے سامنے چبوترے پر بیٹھ گیا اور پوچھا: تو نے اس سے پہلے مجھ سے یہ بات کیوں نہیں کہی؟ تو نے میری بیوی سے اپنا تعارف کیوں نہیں کرایا؟

تاجر نے کہا: مجھے شرم آتی تھی..... میں نہیں چاہتا تھا کہ تیری بیوی کے سامنے بھی شرمندہ ہوں۔ دوکاندار نے پوچھا: دوکان پر کیوں نہیں آیا، کیا میں وہاں پر نہیں تھا؟

تاجر نے جواب دیا: وہاں بھی مجھے تیرے ہمسایہ دوکانداروں سے شرم آ رہی تھی۔ پس بہترین طریقہ یہ تھا کہ تجھ کو ایک ایسی جگہ تلاش کرلوں جہاں کوئی دوسرا نہ ہو..... اب آخر یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ میں کس حال میں گرفتار ہوں۔

دوکاندار نے کہا: یہ حالات جو تجھ پر طاری ہیں، ان کی وجہ سے مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ پتا چلاؤں کہ تیرے سر پر کیا پہاڑ ٹوٹا ہے..... سب سے بہتر کام یہ ہے کہ میں تیرے لیے پہلے ایک مناسب لباس فراہم کروں.....تو حمام جا اور نیا لباس پہن..... اس کے بعد تیرے لیے مکمل کھانا تیار کروں اور جب تو خوب اچھی حالت میں آجائے، پھر وہ وقت آئے گا کہ باہم بیٹھیں اور بات چیت کریں۔

اس مختصر گفتگو کے بعد تاجر حمام چلا گیا، نیا لباس پہنا اور اس دن کھانا بھی مناسب کھایا اور جب رات ہوگئی، دونوں نے کمرے کے ایک کنارے پر دیوار سے کمر لگائی۔ کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تا کہ ہر طرح کی بات کوئی اور نہ سن سکے۔

دوکاندار نے اپنے پرانے دوست و رفیق کی طرف دیکھا اور کہا: ٹھیک ہے، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مجھے بتا کہ اس دوران تو کہاں تھا، کیا کر رہا تھا اور ایسا کیا ہوا کہ اس طرح مشکل میں گرفتار ہوگیا؟

تاجر نے کہا: میں سات برس قید خانے میں رہا۔ ان سات برسوں میں میری کمر جھک گئی۔ میرے بال سفید ہوگئے اور میں اپنی قوت و سکت سے محروم ہوگیا۔

دوکاندار نے جو یہ سنا تو تعجب کا اظہار کیا اور کہا: تو سات برس قید میں رہا؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے، تو نے تو کبھی کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا، اور خلاف قانون کام نہیں کیا کہ جس کی وجہ سے سات برس جیل میں رہنا پڑے۔

تاجر نے افسوس اور رنجیدگی سے سر ہلایا اور جواب دیا: ہاں..... لیکن میں تو ایک اچھے کام کی وجہ سے گرفتار ہوا تھا..... خیر کا وہ کام جو میں نے ایک ناقدرے کے لیے انجام دیا تھا۔

دوکاندار کو اس پر تعجب ہوا۔ اس نے کہا: کیا کوئی اچھے کام کی وجہ سے بھی نقصان اٹھاتا ہے؟

تاجر، دوکاندار کے گھر میں مہمان تھا۔ اس نے اپنی گرفتاری کی داستان اس طرح بیان کی:

امیر شہر کو میرے کاروبار کی اطلاع تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں اپنا سامان

فروخت کرنے اس شہر میں آتا ہوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس شہر میں مشہور سنار اور جوہری بھی ہیں..... ایک روز جب میں تیرے شہر میں آنے کا ارادہ کر رہا تھا، اس نے مجھے بلایا اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی لڑکی کو سربلندی کے ساتھ اس کے گھر روانہ کروں..... اس خاطر میں نے بہت دن سے آج تک اس کے لیے ایک یاقوت محفوظ رکھا ہے..... میں چاہتا ہوں کہ جب تو اپنے اس ساز و سامان کے ساتھ تجارت کے لیے سفر پر نکلے، تو یاقوت اپنے ساتھ لے جا اور اسے فروخت کر دے.....

مجھے امیر شہر کے اپنے اوپر اس اعتماد سے بہت خوشی ہوئی تھی، میں نے یہ تجویز فوراً قبول کر لی اور اس سے کہا: جناب امیر! ٹھیک ہے جس وقت بھی آپ فرمائیں گے، میں حاضر ہوں وہ یاقوت آپ سے لے لوں اور اس شہر میں لے جاؤں اور فروخت کر دوں۔

اس گفتگو کے بعد، امیر شہر نے چمڑے کا وہ تھیلا جو اس کے ہاتھ کے قریب رکھا تھا، مجھے دے دیا اور مجھ سے کہا: یہ لو، اس تھیلے میں ایک ہزار دینار کے علاوہ وہ یاقوت بھی ہے۔ اس یاقوت کو اچھی قیمت پر بیچ دینا، میں چاہتا ہوں ان دنوں میں اپنی لڑکی کا جہیز تیار کروں..... جو ہزار دینار اس میں ہیں، وہ تیری محنت اور کوشش کی اجرت ہے۔

میں نے تھیلا امیر شہر سے لے لیا۔ تجارت کا مال اکٹھا کیا اور اپنی راہ لی، تیرے شہر کا یہ میرا آخری سفر تھا..... میں تیرے شہر میں آیا اور جو کچھ طے تھا وہ فروخت کیا اور دوبارہ اپنے ملک واپس جانے کا ارادہ کیا..... نہیں معلوم اس بار کیوں میری یہ خواہش ہوئی کہ شہر کو گھوم پھر کر دیکھ لوں..... میں نے ایسا ہی کیا..... میں ٹہلتا ہوا شہر کے باغوں کے پاس سے گزرا، یہاں تک کہ آہستہ

آہستہ ایک دریا پر پہنچا جو شہر کے ایک کنارے پر بہتا ہے..... میں تھک گیا تھا، دھوپ بھی بہت کھائی تھی۔ جب میں نے ٹھنڈا اور بہتا پانی دیکھا تو خود سے کہا کہ کیوں نہ جسم پر پانی ڈال لوں اور اس طرح یہ تھکن اور گرمی اپنے جسم سے دور کرلوں؟ پس دریا کے کنارے اپنے کپڑے اتارے اور دریا کے ٹھنڈے پانی سے اپنا سر، چہرہ اور جسم دھویا۔ اس کے بعد پانی سے باہر آ گیا..... اپنا جسم پوچھا، خشک کیا اور دوبارہ کپڑے پہنے۔ اسی وقت یکبارگی مجھے محسوس ہوا کہ بہت ہی ہلکا ہوگیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اسی خیال میں غرق تھا کہ مجھے یاد آیا کہ امیر شہر کا تھیلا جو میں نے انٹی میں رکھا ہوا تھا، نہیں ہے۔ پریشان اور سر پیٹتا ہوا شہر کی طرف دوڑا، جو جگہ بھی جانتا تھا، وہاں گیا لیکن اس تھیلے کی کہیں کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: اب اس سے زیادہ اس شہر میں رہنے اور افسوس کرنے سے مسئلہ تو حل ہوگا نہیں..... یہ یاقوت بھی چند ہزار دینار سے زیادہ کی قیمت کا نہیں ہے۔ امیر شہر کے پاس جاتا ہوں، اس کو رقم دے دیتا ہوں اور اس طرح اس پریشانی سے نجات حاصل کرلیتا ہوں۔

بالآخر امیر شہر کے پاس گیا اور تھیلے کے گم ہوجانے کا واقعہ اس سے بیان کردیا۔

امیر شہر یہ واقعہ سن کر بہت بگڑا اور کہا: تو نے فریب اور دھوکا کیا ہے۔ اس یاقوت کی پچاس ہزار دینار سے زیادہ کی قیمت تھی۔ یہ میرا گناہ تھا کہ میں نے اپنی پونجی اور اپنی لڑکی کی آئندہ زندگی کے لیے جہیز کی رقم تیرے سپرد کردی..... اب جلدی کر، مجھے پچاس ہزار دینار ادا کر ورنہ وہ سزا دوں گا کہ راستہ، سفر اور تجارت سب بھول جائے گا۔

میرے پاس سوائے پچاس ہزار دینا رسے زیادہ کی رقم نہیں تھی۔ میں نے کہا: محترم امیر! اب اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے، اور آپ کو یہ خیال

ہے کہ میں نے خیانت کی ہے، تو مجھے کم از کم کچھ وقت دیجئے تا کہ آپ کے لیے پچاس ہزار دینار کا انتظام کرسکوں۔

امیر شہر یاقوت کے گم ہوجانے اور میری باتوں سے بہت غصے ہوگیا تھا۔ اس نے میرا سارا سامان نیلام کرادیا اور اس کے باوجود مجھے قید میں ڈال دیا۔ چوں کہ شہر کا کوئی بھی دوسرا تاجر میرا یقین نہیں کررہا تھا، میں ان کی نگاہوں سے بھی گر گیا۔ ان میں سے کسی نے بھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ عاقبت کار جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا قید خانے میں ہوں اور پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ آخر کار سات سال گزرنے کے بعد قید سے آزاد ہوا، اکیلی وہ جگہ جس سے میں واقف تھا، تیری دکان اور اکیلا وہ شخص جو میرا یقین کرے گا، وہ تو تھا۔ اب اے بندۂ خدا! اب کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کوئی غلط اور ناجائز طریقہ اختیار کیا تھا اور امانت میں خیانت کی تھی۔ دوکاندار نے جب اس تاجر کی گرفتاری کی خبر سنی تو ایک لمحے کے لیے حیرت میں پڑ گیا۔ پھر اس نے تھیلے کے بارے میں پوچھا، تاجر نے تھیلے کے بارے میں بتادیا۔

جب دوکاندار نے تھیلے کے بارے میں سنا اور اس کی شکل وصورت کا بھی اسے علم ہوا تو زار و قطار رونے لگا اور کہا: ارے بندۂ خدا!..... تیرا وہ تھیلا اب میرے پاس ہے۔ حالاں کہ اگر مجھے وہ تھیلا نہ بھی ملتا، پھر بھی میں یہ بات مان لیتا کہ تو کبھی بھی امانت میں خیانت نہیں کرسکتا۔

تاجر اب دوکاندار کے رونے دھونے پر تعجب کررہا تھا، اس نے پوچھا: آخر وہ تھیلا تیرے پاس کیا کررہا ہے؟ دوکاندار نے بھی سارا ماجرا کہہ سنایا جو پیش آیا تھا اور پھر کہا: جب اس شہر میں تیری کوئی خیر خبر نہیں آئی، میں نے اس میں سے ایک ہزار دینار نکال لیے اور اس طرح پریشانیوں سے نجات حاصل کرلی اور

ہاں وہ یاقوت اسی طرح صحیح سالم اور اچھوتا موجود ہے، جو کچھ میں نے کیا اس سے راضی ہے؟

تاجر مسکرایا اور کہا: خدا تجھ سے راضی رہے۔تو نے تو پہلے ہی سے رقم اس لیے تھیلے سے نہیں نکالی تھی کہ مجھے واپس دے گا۔اب ان دیناروں میں سے مجھے فقط ہزار دینار دے دے تا کہ جس طرح ہو سکے جلد سے جلد اپنے ملک وشہر پہنچ سکوں اور یاقوت امیر کے منہ پر مار سکوں۔اور اس کو اس کے کیے پر پشیمان کر سکوں۔

دوکاندار کھڑا ہوا اور اسی حال میں کہ اس کی آنکھیں ابھی رونے سے نمناک تھیں، اس نے کہا: میں یہ تین سو دینار تیرے لیے فراہم کر رہا ہوں، لیکن چند سال پہلے کی تیری بات مجھے یاد آ گئی ہے۔

تاجر نے پوچھا: وہ کیا بات تھی؟

دوکاندار نے کہا: جب چند سال قبل میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اگر میری زندگی کی گاڑی چل رہی ہے تو اس کی وجہ اس شہر میں تیرا آنا ہے۔تو نے جواب دیا تھا کہ یہ سب وسایل ہیں۔ہماری روزی روٹی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

تاجر نے جواب دیا: ہاں..... اور اگر خدا نہ ہوتا اور یاقوت کا وہ تھیلا کسی دوسرے کے ہاتھ لگ جاتا تو میں آخر عمر تک فقر و فلاکت میں رہتا اور یہ بھی ہے کہ کوئی بھی یہ یقین نہ کرتا کہ میں نے امانت میں خیانت نہیں کی ہے۔

☆☆☆

دو لومڑیاں

برسوں پہلے،قدیم زمانے میں آبادی کے قریب ایک لومڑی رہتی تھی۔

جناب لومڑی کا اپنے سب ہم جنسوں کی طرح یہی کام تھا کہ پرندوں کے گھونسلوں پر حملہ کرے اور ایسے پرندوں کا گوشت کھاجائے جو اس کے فریب اور دھوکے سے اس کے جال میں پھنس جاتے تھے۔ اس وصف کے باوجود، اس لومڑی میں دوسری لومڑیوں سے ایک فرق تھا۔ اور وہ اس کا یہ غرور و تکبر تھا کہ وہ دوسری لومڑیوں سے زیادہ جانتی ہے اور اپنے زمانے کی لومڑیوں کی سردار ہے۔

وہ جس وقت بھی اپنے دوستوں، رشتے داروں اور ہمسایوں سے بات چیت اور گفتگو شروع کرتی، انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں اطلاع دیتی کہ آخر کار ایک دن آنے والا ہے کہ وہ لومڑی کی کھال سے باہر آئے گی اور اصلاً ایک ایسے نئے جانور کی شکل اختیار کرے گی کہ دنیا اور لوگ اسے دیکھیں گے اور تعجب و حیرت میں غرق ہوجائیں گے۔

ایک بار ایک دن یہ بلند پرواز لومڑی شکار کرنے اپنے کچھار سے باہر گئی، وہ ایک دور دراز علاقے میں ایک کھنڈر اور اس کے نزدیک ایک آبادی میں اس نے آوازیں سنی۔ ہا، ہُو کی یہ آوازیں ایک دیو کی آوازوں کی مانند تھیں جن سے ہر

متحرک کا دل لرز اٹھے اور اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جائے۔

مغرور لومڑی یہ آواز سن کر بہت زیادہ ڈر گئی اور جس کی وجہ سے وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکی۔

مختصر یہ کہ ڈرنے اور لرزنے کے کچھ دیر بعد، اس نے اپنے آپ کو ایک جھٹکا دیا، اپنے پیروں کو جو کیل کی طرح زمین میں گڑ گئے تھے، زمین سے اٹھایا۔ پھر اس کے آس پاس دوڑنا شروع کیا تا کہ اس آواز دینے والے کے شر سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ وہ مستقل اپنے آگے اور پیچھے دیکھ رہی تھی، اس نے خود سے کہا: ''یہ آواز آخر تھی کیا اور کہاں سے آئی تھی، زمین سے آئی تھی یا آسمان سے''؟ وہ جس قدر زیادہ سوچتی، اتنا ہی کم اس کی سمجھ میں آتا۔

میں تمہیں کیا پریشان کروں، یہ بلند پرواز لومڑی جب خوف اور وحشت زدگی کی وجہ سے بھاگ رہی تھی، اس نے اپنے راستے میں ایک دوسری لومڑی کو دیکھا۔ وہ بھی دوڑ رہی تھی اور دوڑتے ہوئے اس نے پوچھا: کیا خبر ہے؟ کس وجہ سے فرار اختیار کیا ہے؟

خوف زدہ لومڑی یہ کوشش کر رہی تھی کہ خود کو اس طرح ظاہر کرے کہ وہ پرسکون اور متفکر ہے، ایسی حالت میں اس نے کہا: میں اپنے ایک بڑے پیشین گوئی کرنے والے استاد کے پاس سے واپس آئی ہوں۔ اس نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ حالات کو دیکھ کر جنہیں باقی دوسرے سمجھنے سے محروم ہیں، یہ سمجھ لوں کہ کیا اتفاق پیش آنے والا ہے۔

سادہ دل لومڑی نے مغرور لومڑی کی یہ بات سنی، حیرت زدہ ہوئی اور پوچھا: ٹھیک ہے، کیا تو بتا سکتی ہے کہ آئندہ چند روز میں کیا اتفاق پیش آنے والا ہے؟

بلند پرواز لومڑی نے، جو ڈرتے ہوئے دوڑ رہی تھی، جواب دیا: میرا خیال

ہے اس جگہ پر جہاں سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں، جلد ہی ایسے شیر پیدا ہوں گے، جو لومڑیوں کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔

سادہ دل لومڑی فریب میں آ گئی اور پوچھا: بس تو اب مجھے بتاؤ کہ مجھے کس طرف سے جانا چاہیے؟ مکار لومڑی نے ایسے ہی ایک طرف اشارہ کیا اور کہا: جلدی کرو، جس راستے سے میں جا رہی ہوں، اسی طرف آ جاؤ تا کہ شیر کے پنجوں میں گرفتار نہ ہوں۔

سادہ دل لومڑی اب بھی نہیں سمجھی کہ معاملہ کیا ہے اور اسی خوف و وحشت میں لومڑی کے ساتھ ہولی چوں کہ ہا، ہُو کی نامعلوم آوازوں نے اس کا سارا جسم خوف و ہراس سے بھر دیا تھا۔ وہ دونوں دوڑ رہی تھیں اور خیالی شیر کے پنجوں سے جو معلوم نہیں کس طرف سے ان پر حملہ کرنے والا ہے، فرار کر رہی تھیں۔

دوڑتے ہوئے مکار لومڑی بہر حال یہ چاہتی تھی کہ یہ جان لے کہ ہا، ہُو کی انجان آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ کبھی رک جاتی اور آس پاس کا جائزہ لیتی اور چاروں طرف دیکھتی۔

سادہ دل لومڑی اس کی ان حرکتوں اور کھیل سے تھک گئی اور پریشان ہو چکی تھی، اس نے پوچھا: ٹھیک ہے۔ تو کہتی تھی کہ ممکن ہے اس حالت میں اور اس جگہ پر ہم شیر کے پنجوں کا شکار ہو جائیں۔ تو پھر کیوں اس قدر الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہے؟ کیوں جلدی سے فرار نہیں کرتی کہ ہم موت سے نجات حاصل کر لیں؟

مکار لومڑی نے اپنے ہمراہی کو جواب دیا: فرار کرنا ٹھیک ہے اور شیر کے پنجوں سے جان کو سلامت رکھنا بھی ٹھیک، لیکن میرے اِس طرف اُس طرف دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ اگر راستے میں کوئی لقمہ نظر آ جائے، تو اس کو ہاتھ سے جانے نہ دوں۔

سادہ دل لومڑی نے ان باتوں پر یقین کرلیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا اور چلتی رہی۔ وہ چلتے چلتے ایک دوراہہ پر پہنچیں۔

اس وقت مکار لومڑی نے پھر ایک فریب و حیلہ کرنے کی سوچی اس لیے اس نے اپنی دوست لومڑی کی طرف منھ کیا اور کہا: کھانے کی بو آ رہی ہے۔ تیری بھی کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟

سادہ دل روباہ اس قدر دوڑی تھی کہ اس کو بھوک لگنے لگی تھی۔ اس نے کہا: مگر کس طرح؟ کیا تو اس کھانے کے بارے میں بھی پیشین گوئی کرسکتی ہے جو ابھی تک ہمارے ہاتھ نہیں لگا ہے؟

ڈری ہوئی لومڑی نے اپنا سر ہلایا، اپنی دم زمین پر پھیلا دی اور کہا: میرا دل کہتا ہے کہ یہ کنارے کا تنگ راستہ جو تیرے روبرو ہے، مرغوں اور مرغیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر تو اب اس جگہ چلی جائے تو مجھے اطمینان ہے کہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے گی۔

سادہ دل لومڑی نے اس بار بھی اس کی باتوں پر اعتبار کرلیا اور کہا: ٹھیک ہے، اگر یہ بات ہے تو ہم دونوں ہی وہاں ساتھ کیوں نہ جائیں؟ بس دوست دیر کس بات کی؟

دھوکے باز لومڑی نے، پہلے کی طرح، خود کو کسی فکر میں ڈوبے ہوئے ظاہر کیا اور کہا: شیر کے سانسوں کی بو آ رہی ہے۔ تو کھانے کی تلاش میں جا، اگر مجھے اطلاع ہوگئی اور کوئی خطرہ درپیش ہوا، تیرے پیچھے آجاؤں گی تاکہ تجھے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

ہر طرف سے بے خبر اس لومڑی نے جب یہ بات سنی تو بہت عجلت سے کنارے کے راستے پر دوڑ پڑی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے بلند پرواز لومڑی نے

ہا، ہُو کی آواز سنی تھی۔ اس کام سے اس کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو جائے کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور وہ آواز کس کی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی خطرہ ہے اور کوئی خاص بات ہے تو سادہ دل لومڑی کی طرف متوجہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس بیچاری لومڑی نے اس طرف کی راہ لی اور چلی گئی تو مکار لومڑی اس بیچاری لومڑی کی سادگی پر دل ہی دل میں ہنسی اور اسی علاقے کے آس پاس دوڑنے میں مشغول ہوگئی تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ کیا ہونے والا ہے، کیا اتفاق رونما ہونے والا ہے۔

فریبی لومڑی ہا، ہو کی نامعلوم آواز سے جس کی وجہ سے اس کے وجود میں خوف و ہراس بھر گیا تھا، بھاگنے میں مشغول تھی۔ اس نے یکبارگی اپنے راستے پر ایک ٹوٹا ہوا آفتابہ (لوٹا) دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت موسم پرسکون تھا اور نسیم آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور اس پرانے لوٹے سے ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ٹوٹے ہوئے لوٹے کو دیکھ کر حیرت سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش مند ہوگئی۔ لوٹے کو دیکھا اور اس سے نکلنے والی آواز سنی تو حیرت سے اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اب وہ وہاں کھڑی ہوگئی اور اس ٹوٹے ہوئے لوٹے کو دیکھنے لگی۔ اس وقت مغرور لومڑی جو یہ سوچتی تھی کہ وہ دنیا اور انسانوں کی تمام چیزوں کے بارے میں جانتی ہے، سمجھی کہ ہا، ہُو کی وہ تیز آواز اس ہوا کی آواز تھی جو اس لوٹے میں بھر جاتی تھی۔

جب لومڑی نے محسوس کیا کہ وہ بڑا فریب کھا چکی ہے تو اس نے لوٹے کی طرف رخ کیا اور کہا: تو یہ تو تھا جس نے مجھے آج پہاڑ و دشت اور بیابانوں میں حیران و سرگرداں کیا تھا۔ اب میں تجھ پر ایسی بلا نازل کروں گی کہ اس کے قصے لکھے جایا کریں گے۔

لومڑی نے یہ کہا اور لوٹے کی طرف کو دی۔ اس وقت اتفاق سے سادہ دل لومڑی جو غصے میں اس سے لڑنے بھڑنے کا ارادہ رکھتی تھی، وہاں نکل آئی۔

وہ فریبی اور مغرور لومڑی کے پاس آئی اور کہا: تجھے معلوم بھی ہے کہ تیرے بھیجے میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ مجھے خواہ مخواہ کھانے کے چکر میں دوڑا دیا، کہاں اور کونسا کھانا؟

فریبی لومڑی نے اس بیچاری کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا: کھڑی کیوں ہے؟ تجھے خبر نہیں؟ وہ آ رہا ہے، شیر راستے میں ہے۔ اگر تو غور کرے تو پتا چلے کہ میں اب تک تیرے انتظار میں یہاں کھڑی ہوں، وجہ یہ تھی کہ تجھے شیر کے آنے کی خبر دوں۔

ظاہر ہے آپ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ فریبی لومڑی اپنی ہمراہی کے لیے وہاں منتظر نہیں تھی، وہاں ٹھہرنے سے اس کا مقصد لوٹے سے انتقام لینا تھا جس سے شور وغل اور ہا، ہو کی آواز نکل رہی تھی۔

ان باتوں کے بعد، سادہ دل لومڑی نے کچھ سوچنے کی فرصت پائے بغیر، بھاگنا شروع کر دیا۔ دونوں دوڑنے لگیں۔ دھوکے باز لومڑی نے ایک بار پھر یکا یک اپنا راستہ بدل دیا اور اسی جگہ لوٹ آئی جہاں اس نے لوٹا دیکھا تھا۔ اب وہ وقت تھا کہ اس سے سخت انتقام لے۔ اس وجہ سے وہ آگے بڑھی اور اپنی دم لوٹے کے دستے میں باندھ لی اور اسے گھسیٹنا شروع کر دیا اور اس دریا کی طرف چل پڑی جو وہاں نزدیک ہی میں تھا۔

جب وہ تھکی ہاری اور سانس پھولے ہوئی دریا پر پہنچی تو نگاہ ڈالی اور کہا: ٹھیک، اب میں تجھے دکھاؤں گی کہ شور وغل مچانا اور لومڑی کو ڈرانا کس قدر وحشت ناک نتائج کا باعث ہوں گے۔

لومڑی نے یہ کہا اور آگے بڑھی تا کہ لوٹے کو دریا میں غرق کردے۔

لوٹا جیسے ہی پانی میں ڈوبنے لگا، پانی اس کے اندر داخل ہونے لگا اور گلپ گلپ کی آواز آنے لگی۔ دھوکے باز لومڑی سمجھی کہ لوٹا اس حرکت سے ڈر گیا اور اب درخواست کررہا ہے۔ وہ لوٹے کی طرف دیکھ کر چیخی اور کہا: یہ باتیں اس وقت کہی ہوتیں جب تو اپنی حرکتوں سے مجھے ڈرا رہا تھا۔ اب تو بس صرف اپنی موت کی فکر کر!

لومڑی کی ان باتوں اور دھمکیوں کے بعد، لوٹے نے یکبارگی گلپ کیا اور اس کے بعد اس کی کوئی آواز نہیں آئی۔ لومڑی زور سے ہنسی اور کہا: یہ بھی دوسروں کے لیے ایک درس عبرت ہے کہ میرے منھ نہ لگیں۔

اس کے بعد وہ غرور وتکبر سے اپنی راہ لینی چاہتی تھی کہ اسے احساس ہوا جیسے کسی شخص نے اسے پکڑلیا ہے اور پانی میں گھسیٹ رہا ہے۔

دھوکے باز لومڑی جو یہ سوچ رہی تھی کہ زمین وآسمان اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں، اب اپنے ہاتھ پیر مارنے لگی اور داد وفریاد کرنے لگی: تو کون ہے جس نے مجھے پکڑلیا ہے اور پانی میں گھسیٹ رہا ہے؟ چھوڑ مجھے۔

اس نے کتنا ہی صبر کیا، مگر کسی کی آواز نہیں سنی۔

بالآخر بہت ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ چیز جو اسے پانی میں کھینچ رہی ہے، کچھ اور نہیں بلکہ وہ لوٹا ہے جو پانی سے بھر گیا ہے۔

لومڑی غصے میں آ گئی، بھر بھی کوشش کرتی رہی، لیکن وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکی۔ آخر کار اس نے لوٹے کے شر سے خلاصی کا یہ طریقہ سوچا کہ اپنی دم کاٹ دے۔ اس نے یہی کیا بھی۔ اپنا منھ موڑا اور اپنی دم کو اتنا چبایا کہ اس کی دم پرانے لوٹے کے ساتھ دریا کی تہہ میں بیٹھ گئی جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو

وہ تھکی ہاری پانی میں بھیگے ہوئے ایک چوہے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو دریا سے باہر نکالا اور وہاں سے چل دی تا کہ اپنی اس پریشانی کا کوئی حل ڈھونڈ سکے۔

اس کے باوجود وہ خوش تھی کہ اسے دریا سے نجات مل گئی اور وہ خود کو سلامتی کے ساتھ بچا سکی۔ ایک مدت تک ادھر ادھر سر مارنے کے بعد، اس نے اپنے آپ سے کہا: اس حال میں کیا کروں؟ اگر میری قوم اور قبیلہ مجھے اس حال میں دیکھے گا تو میں انہیں کیا جواب دوں گی؟

لومڑی اپنے اوپر آنے والی بلا سے فکرمند اور مضطرب تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ایک بازار میں پہنچی۔ بازار میں لوگ ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اور ہر شخص اپنے کام میں مصروف تھا۔

لومڑی نے بازار میں بھیڑ اور لوگوں کی مصروفیت کو دیکھا اور اپنے آپ سے کہا: بہتر ہے کہ اس بازار میں اپنے لیے کوئی کھانا تلاش کروں اور کچھ زمانے تک دوسری لومڑیوں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھوں، اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔

بے دم کی لومڑی نے اپنے آپ سے یہی قول و قرار کر لیا اور بازار کے گوشہ و کنار سے اپنے جانے کی راہ تلاش کر لی اور وہاں سے بھاگ گئی۔

اس وقت دو تین بچوں نے، جو بازار میں کھیل کود میں مشغول تھے، لومڑی کو دیکھ کر، کھیل کود سے ہاتھ کھینچ لیا اور لومڑی کا تماشا دیکھنے میں سرگرم ہو گئے۔

آخر لومڑی اپنی اس وضع قطع کی وجہ سے دیکھنے کی چیز بھی تھی۔

ان میں سے ایک بچہ جو بے دم کی لومڑی کو دیکھ کر بہت خوش تھا، زور سے چیخا کہ دیکھو دیکھو، وہ بے دم کی لومڑی، وہ بے دم کی لومڑی۔

چند بے کار اور بے عار لوگوں نے جو ایسے واقعہ کے پیش آنے کے منتظر رہتے ہیں، شور مچا دیا اور بیچاری بے دم کی لومڑی کا پیچھا کرنے لگے۔

لومڑی نے بھی محسوس کیا کہ اس کو ایک بلا سے تو نجات مل گئی لیکن اب ایک دوسری ہی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہے، اس لیے اپنی جان بچانے کے لیے اس نے بازار ہی میں دوڑنا شروع کر دیا۔

مغرور اور بلند پرواز لومڑی، جس نے اپنی دم گنوا دی تھی، بھاگ رہی تھی اور کچھ لوگوں نے اسے پکڑنے کے لیے بازار سر پر سر اٹھا رکھا تھا۔

لومڑی سر راہ رکھی ہوئی چیزوں پر سے، چھوٹے بڑوں کے سروں کے اوپر سے چھلانگیں لگا رہی تھی، تا کہ جس طرح بھی ہو سکے خود کو اس بلا سے نجات دلا سکے۔

وہ بھاگتے ہوئے اور فرار کے عالم میں بھی جس دوکان پر بھی پاؤں رکھتی، دوکاندار اسے باہر نکال دیتا، اور اس طرح اسے پھر اسی ہنگامے کا سامنا کرنا پڑتا۔

آخر کار وہ بلا میں گرفتار لومڑی اسی طرح بھاگتی دوڑتی رہی۔ اس نے اپنے سامنے ایک رنگریز کی دوکان دیکھی جس میں دوکاندار موجود نہیں تھا۔ حالاں کہ وہ اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی، لیکن خوف و ہراس سے رنگریز کی دوکان میں گھس گئی اور رنگنے کے ایک برتن کے پیچھے چھپ گئی۔ جو بھیڑ اس کا پیچھا کر رہی تھی، رنگریز کی دوکان کے سامنے رک گئی اور لومڑی کے وہاں سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ دوکان میں گھس جائیں، چوں کہ رنگریز دوکان میں نہیں تھا، اس لیے انہوں نے دوکان میں داخل ہونے سے گریز کیا۔ وہ منتظر رہے کہ رنگریز آ جائے اور اس کے بعد اس سے کہیں کہ لومڑی کو باہر نکال دے۔

وہ کچھ دیر دوکان کے سامنے منتظر رہے۔ آخر کار رنگریز جو کسی کام سے باہر

گیا تھا، آ گیا۔ رنگریز نے اپنی دوکان کے سامنے بھیڑ دیکھی تو پوچھا معاملہ کیا ہے۔ جب وہ سمجھ گیا کہ صورت حال کیا ہے، تو اس نے ایک لکڑی اٹھائی اور دوکان میں لومڑی کو ڈھونڈنے لگا۔

بالآخر اس نے لومڑی کو ایک گوشے میں دیکھ لیا۔ لکڑی اٹھائی اور چاہتا تھا کہ لکڑی اس بدنصیب کے سر پر مار دے کہ لومڑی نے ایک جست لگائی اور دوکان کے ایک دوسرے گوشے میں کود گئی۔ لومڑی دوڑتی رہی اور رنگریز بھی اس کا پیچھا کرتا رہا۔

لومڑی نے چالاکی سے ایک گوشے سے چھلانگ لگائی۔ بے پناہ تھکن اور بے حالی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ رنگ کے برتن میں جا پڑی۔

بھیڑ نے جب یہ دیکھا کہ لومڑی یکا یک رنگریز کے برتن میں گر پڑی ہے، تو وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔ ان کو اس بیچاری لومڑی پر رحم آ گیا۔ انہوں نے سوچا کہ لومڑی بیچاری مرگئی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ مشکل میں پھنسی ہوئی لومڑی نے ایک چیخ ماری۔ وہ ایسی حالت میں کہ چہرہ کا رنگ اترا ہوا اور جسم پر رنگ ملا ہوا، برتن سے باہر کودی اور پھر سے دوڑ لگانی شروع کردی۔

چند لوگ جو اس کے باہر آنے کے منتظر تھے، کچھ دیر اس کے پیچھے بھاگتے رہے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ وہ بیچاری اِدھر سے بھگائی گئی اُدھر سے باہر کی گئی، لاچار ہوچکی ہے وہ بے بس ہے، لومڑی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا وہ بھی بازار اور شہر سے فرار کرگئی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

لومڑی نے کچھ دیر دوڑنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے کوئی آدمی نظر نہیں آیا، آرام کا سانس لیا، راستہ چلنے والوں کی آنکھوں سے دور ایک گوشے

میں لیٹ گئی تا کہ اس بھاگ دوڑ سے ہونے والی تھکن کو جسم سے رفع کر سکے۔

بالآخر جب اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے تو اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ اپنی قوم اور اپنے قبیلے میں جائے گی۔ اپنی دم کٹنے کا قصہ دہرانا ہر چند اس کے لیے نہایت سخت اور ناگواری کا باعث تھا، اس لیے وہ اس فکر میں پڑ گئی کہ کوئی ترکیب سوچ لے اور کوئی قصہ گھڑے تا کہ لوگ اس کی بات کا یقین کر لیں۔ لیکن اس نے جتنا سوچا، اتنا ہی حل اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ بالکل اس حالت میں کہ وہ ہر طرف سے ناامید ہو چکی تھی کہ یکبارگی اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں پر پڑی جو رنگین ہو چکے تھے۔

وہ اس صورت حال سے خوش ہوئی اور اپنے آپ سے کہا: اس سے بہتر کچھ اور نہیں ہو سکتا، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی دیرینہ آرزو کو پورا کروں..... اصلاً کون کہتا ہے کہ میں لومڑی ہوں؟ یہ نقش و نگار، یہ رنگ روپ جو مجھے حاصل ہو گئے ہیں، دنیا کی تمام لومڑیوں کو اس پر رشک کرنا چاہیے۔

لومڑی نے یہ کہا اور اپنے آپ سے یہ قول و قرار باندھ لیا۔ وہ یہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کا بات کرنے کا طرز، چلنے کا طریقہ اور دیکھنے کا انداز دوسری لومڑیوں سے مختلف ہونا چاہیے۔ وہ آرام سے بغیر سر و صدا کیے اپنے قبیلے میں پہنچ گئی۔

جیسے ہی اس نے اپنے قبیلے میں پیر رکھا، لومڑیوں نے اس نووارد کی عجیب و غریب شکل و شمایل کو دیکھا اور تعجب میں غرق ہو گئیں۔

بہ ظاہر وہ ایک ایسے جانور کو دیکھ رہی تھیں جو شکل و صورت میں ان ہی جیسا تھا، لیکن اس کی کھال اور صورت کا رنگ ان سے مختلف تھا۔ اس کے دم بھی نہیں تھی۔ اس وجہ سے وہ اس کے چاروں طرف گھومتی اور اس کو دیکھتی رہیں۔

بالآخر کچھ دیر بعد جب وہ اس بے دم کی لومڑی کو دیکھ دیکھ کر تھک گئیں، تو انہوں نے پوچھا: ''آپ کون ہیں جناب؟'' لومڑی نے غرور و خود پسندی سے سر ہلایا اور کہا: میں پہلے زمانے میں اور اس وقت سے کہ عقل سے محروم تھی، لومڑیوں کے قبیلے میں تھی۔ لیکن چوں کہ مجھے پسند تھا کہ ایک لومڑی کی زندگی سے رہائی حاصل کروں تو میں گئی اور موروں کے قبیلے میں شامل ہوگئی۔ اب مجھے بتاؤ کون ہے جو مور بننا پسند نہیں کرے گا؟ کون پسند نہیں کرے گا کہ اس کے جسم کی کھال رنگ برنگی نہ ہوجائے؟

جن چند لومڑیوں نے ان باتوں پر یقین کرلیا تھا؟ وہ اس کے چاروں طرف گھومتی رہیں اور اس کی باتوں کو سننے میں مشغول رہیں۔

بے دم کی لومڑی نے جب دیکھا کہ اس کی باتوں کو قول معروف کے طور پر قبول کیا جارہا ہے اور چند سادہ لوح لومڑیاں اسے سن رہی ہیں، تو اس نے کہا: لیکن پہلی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں آڑے آنے والی اِس دم کو اپنے سے دور کرو۔ دنیا میں جہاں جاؤ، جس جگہ بھی پہنچو، ہر شخص تمہاری یہ دم دیکھ کر خبردار ہوجاتا ہے کہ تم لومڑی ہو۔

لومڑی اپنی اس حرکت سے یہ چاہتی تھی کہ قوم و قبیلے کی لومڑیاں اپنے آپ کو دم سے محروم کرلیں تاکہ وہ خود دوسری باقی لومڑیوں میں انگشت نما نہ ہو۔

اتفاق سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب بھی ہوگئی۔ ابھی اسے بات چیت کرتے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ سادہ دل لومڑیوں نے جو اس دنیا کے کاروبار اور اپنے حال و احوال سے بے خبر تھیں، احساس کیا کہ ان کے جسم میں دم بھاری پن کا باعث ہوتی ہے اس لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ آسانی سے دم کو اپنے جسم سے جدا کرسکیں۔

وہ اس فیصلے اور اس فکر پر غور کر رہی تھیں کہ اچانک ایک اور ہی لومڑی وہاں آ پہنچی۔ یہ وہی تھی جو اس سے قبل بے دم کی لومڑی کی ہمراہی کر رہی تھی۔

سادہ دل لومڑی نے دوسری لومڑیوں کو دیکھا اور پوچھا کہ قصہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک لومڑی کے مور بن جانے کا قصہ بیان کر دیا۔ سادہ دل لومڑی کی اب آنکھیں اور کان کھل چکے تھے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ حالات کیا ہیں۔ اس نے جب یہ قصہ سنا، کھڑی ہوگئی، ہنسی اور کہا: مجھے معلوم نہیں کہ یہ لومڑی کہاں تھی، کس کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور اس نے کس طرح یہ رنگ و روپ اختیار کیا ہے۔ لیکن آج صبح یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ پیشین گوئی کرنے والی بن گئی ہے اور مجھے درندے شیر سے ڈرا رہی تھی۔ بالآخر میں کوہ و دشت اور بیابان میں اِس طرف اُس طرف اتنی دوڑی بھاگی کہ بس عاجز آ گئی۔ صبح اپنی رہائش گاہ سے باہر گئی اور اب خالی پیٹ اپنے ساتھ لائی ہوں۔

دوسری لومڑیوں نے یہ باتیں سنیں۔ دم کٹی لومڑی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھ گچھ کی، لیکن دم کٹی لومڑی کی بات بن نہیں رہی تھی۔ اس نے شرم و خجالت سے سر جھکالیا اور لام قاف ہانکنا بند کر دیا۔ لیکن اس لومڑی کی مشکلوں اور آفتوں کا قصہ جو یہ چاہتی تھی کہ اپنی قوم و قبیلے سے جدا ہو جائے اور دوسرے ہی رنگ و روپ میں ظاہر ہو جائے، باقی رہ گیا اور مجالس میں دہرایا اور محافل میں نقل کیا جانے لگا۔

کسی دن انسان مغرور نہ ہو جائے۔ اپنی قوم و قبیلے سے بیزار نہ ہو جائے اگر ایسا ہوا تو خواہ نا خواہ اس کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ ہاں مگر ایسی لومڑی کی طرح ہو جائے گا جس کی دم کٹ گئی، مشکلوں میں پھنس گئی.....اور راندۂ درگاہ ہوگئی۔

☆☆☆

بوڑھا پہلوان

برسوں پہلے قدیم زمانے میں جب اس دنیاے فانی میں پہلوانی اور جوانمردی کی رسم بہتر طور پر قائم و جاری تھی، ایک معروف ومشہور پہلوان تھا۔ یہ ہمیشہ خیر وخوبی کے کام انجام دیتا اور بوڑھوں اور جوانوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا۔

اس مشہور پہلوان کا کردار وعمل اور قول وفعل دنیا والوں کی فلاح وصلاح کے لیے وقف تھے۔ ایک بار اس کو احساس ہوا کہ اب اس کی زندگی کا جوش و جوانی اور پہلوان کی قوت وطاقت اپنی آخری منزل پر پہنچ رہے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک استاد کے طور پر خدمت کرے۔ شاگردوں کی تربیت کرے جو اس کی موت کے بعد بھی اسی کی طرح ایک فعال اور مفید کاموں کی رسم جاری رکھیں۔

اس خاطر وہ شہر میں تلاش وجستجو کرنے لگا۔ جس جوان کو بھی دیکھ کر اسے یہ احساس ہوتا کہ پہلوانی کے طور طریقے سیکھنے کی لیاقت رکھتا ہے، اسے اپنی سرپرستی کے سائے میں داخل کرلیتا۔ رات دن ، وقت بے وقت ان سے مروت، جوانمردی، غلطیوں کو معاف کردینے اور خدا پر ایمان کی گفتگو کرتا۔ دن میں بھی شہر کے اکھاڑے میں زور کراتا، ورزش کراتا، تاکہ وہ فن کشتی اچھی طرح سیکھ لیں۔

برسوں گزر گئے، بالکل ہم انسانوں کی عمر کی طرح۔

ایک مدت بعد جب پہلوان نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس کے بال سفید ہوگئے ہیں، اس کی قوت اور اس کا قوی ہیکل جسم اب برقرار نہیں۔ اس صورت حال کے باوجود وہ پھر بھی خوش وخرم تھا کہ اس کے بعد بھی جوان پہلوان اس کے طور وطریقوں کو جاری رکھیں گے اور دنیا کی مصیبتوں اور وقت کی بلاؤں اور نامرادیوں کے وقت وہ شہر کے لوگوں کی مدد کیا کریں گے۔

اس صورت حال کے پیش نظر اس نے ایک دن یہ طے کیا کہ شہر کے جوان پہلوان جو سب کے سب اس بوڑھے پہلوان کے شاگرد تھے، ایک دوسرے سے کشتی لڑیں تا کہ ان میں سے سب سے اچھے کا انتخاب ہو سکے، جو منتخب اور سب سے طاقتور ہوگا، وہ بوڑھے پہلوان کا جانشین ہوگا۔

یہ دن، پرشکوہ دن تھا، میونسپلٹی کے لوگوں نے شہر کے ایک بڑے میدان پر پانی اور گلاب چھڑکا۔ اس کے اطراف میں شامیانے لگا دیے تا کہ تماشائی ان کے سائے میں آرام سے کشتی دیکھنے میں مشغول رہیں۔

جس لمحہ بوڑھا پہلوان شہر کے میدان میں داخل ہوا ہر طرف دیکھنے کے قابل شور وغوغا ہوا۔ سب لوگ بوڑھے جوان، چھوٹے بڑے قد آدم کھڑے ہوگئے تا کہ وہ جوان پہلوانوں کی زور آزمائی اور کشتی دیکھ سکیں۔

بوڑھا پہلوان یہ منظر دیکھ کر جوانی کی یادوں میں کھوگیا اور اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ اِسی میدان میں اپنے ہم سن وسال پہلوانوں سے زور کرتا تھا، کشتی لڑتا تھا۔ جیسے ہی ڈھول اور طبلے کی آواز بلند ہوئی، پوڑھا پہلوان چونک گیا، اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ اس کی نگاہیں میدان کے بیچ میں جہاں پہلوانوں کو ایک دوسرے کا سامنا کرنا تھا، گڑ گئیں، لوگوں کے شور وغل اور طبلے اور ڈھول کی آواز بند ہوئی تو وہ پہلوان اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے کھڑے ہوئے اور میدان کے

بیچ میں پہنچ گئے۔

سکوت وانتظار نے تماشائیوں کے سر پر سایہ ڈالا، یہاں تک کہ وہ پرندے جو شہر کے میدان کے اطراف میں درختوں کی شاخوں پر اچھل کود کر رہے تھے، اپنی اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ دو پہلوان اپنے چوڑے چکلے سینوں، مضبوط بازوؤں اور ابھرے ہوئے پٹھوں کے ساتھ دو پہاڑوں کی مانند، ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ اسی کے ساتھ شہر کے میدان کا سکون و خاموشی بھی درہم برہم ہوگئے۔ لوگوں کا ایک گروہ اس پہلوان کی اور دوسرا اُس پہلوان کی واہ واہ کر رہا تھا، ہمت بندھا رہا تھا۔

اس کشتی کی وجہ سے امیر شہر کا سکون و آرام بھی حرام ہوگیا تھا وہ ایک لمحے کے لیے شہر کا امیر ہونا بھول گیا، اپنی جگہ سے اٹھتا اور شدید ہیجان میں زور زور سے چیختا چوں کہ پہلوانوں میں سے ایک اس کا زیادہ پسندیدہ پہلوان تھا۔ وہ ہاتھ ہلاتا اور اس کی تعریف کرتا، ہمت بندھاتا، صرف ایک شخص جو اس ہل چل میں پرسکون، آرام سے اور اطمینان کے ساتھ کشتی دیکھ رہا تھا، وہی بوڑھا پہلوان تھا۔

وہ سکون اور خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے کونسے شاگرد نے کشتی کا فن بہتر طور پر سیکھا ہے اور اپنے حریف کے ساتھ زیادہ جوانمردی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ کشتی میں ایک ہارا اور دوسرا جیت گیا تھا۔ میدان کے بیچ میں ایسا گرد و غبار آسمان کی طرف بلند ہوا تھا کہ دونوں پہلوان دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ گرد و غبار نے ایک موٹے پردے کی طرح انہیں ڈھانک لیا تھا۔

اسی خاطر لوگ بھی خاموش و ساکت ہوگئے۔ جیسے ہی کسی پہلوان کا تنومند جسم کبھی گرد و غبار کے اس موٹے پردے کو ہٹاتا اور ظاہر ہوتا، لوگ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ان کی آوازیں سارے شہر میں گونج رہی تھیں۔ آخر کار ہر کشتی اور زور

آوری کی طرح ان دونوں جوان پہلوانوں کی کشتی بھی انتہا کو پہنچ گئی اور ختم ہوگئی۔

بوڑھا پہلوان ان دونوں پہلوانوں کو دیکھ رہا تھا۔اس نے یکا یک دیکھا کہ اس کا ایک شاگرد جس کے چہرے سے غرور و کامیابی کے آثار ظاہر ہورہے تھے۔تن تنہا، میدان کے بیچ سے ایک طرف چلا اور امیر شہر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

دوسرا پہلوان جو ہار گیا تھا، اب بھی گرد و غبار میں ہاتھ پیر مار رہا تھا اور شرمندگی اور تنہائی میں پڑا تھا۔بوڑھے پہلوان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کی رگ حمیت پھڑکی۔اس کو خیال آیا کہ ایک جوانمرد اس طرح تن تنہا شرم و حیا کے گرداب میں ہاتھ پیر مارے یہ صحیح نہیں۔

اس وجہ سے وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔میدان کے بیچ میں گیا۔اس نے پچھڑے ہوئے پہلوان کو زمین سے اٹھایا۔اس کے سر اور چہرے سے گرد و غبار پوچھا۔اس کے سر پر نوازش سے ہاتھ پھیرا اور کہا: علی تیرا مددگار اور خدا نگہبان، میرے لڑکے! جب تک دنیا باقی ہے اور خدا خدائی کرے گا، اس طرح کے بہت سے قصے رونما ہوں گے۔کشتی میں بھی زندگی کی طرح ہار بھی ہے، جیت بھی، زمین پر گرنا بھی ہے اور فخر سے کھڑے ہونا بھی ہے۔اہم یہ ہے کہ اگر پچھڑ گئے تو گھبراؤ نہیں، ہاتھ پیر نہ پھولیں اور اگر جیت گئے، تو احساس غرور میں مبتلا نہ ہو۔ جوانمردی یہ ہے کہ تمہارا حریف میدان کے اندر تمہارے ماتھے پر بوسہ دیتا اور اس طرح اس مقابلے کی نامہربانی کی زنگ کو تمہارے دل سے صاف کردیتا۔پھر بھی تو دل پر رنج کا اثر نہ ہونے دے، اگر اس نے آج تیرے ساتھ مہربانی کا برتاؤ نہیں کیا، کل وہ بھی ایک دوسری ہی صورتحال سے دوچار ہوگا۔میرا خیال ہے کہ اس مقابلے کی ہمہمی اور لوگوں کے جوش وخروش نے تیرے مدمقابل کو یہ فرض انجام دینے نہیں دیا۔

اس طرح اس کی دلجوئی کرنے کے بعد، وہ میدان میں پہلوان کی جگہ پر گیا، اپنے ہارے ہوئے شاگرد کی پیشانی کو چوما اور اسے میدان میں ایک کنارے لے گیا اور اسے شامیانے کے نیچے جو ہوا چلنے سے لہلہا رہا تھا، اپنے قریب بٹھالیا۔

بوڑھے پہلوان نے ہارے ہوئے پہلوان سے یہ باتیں کہیں، لیکن اس کے دل میں ایک آشوب بپا تھا، ایسا کہ اس کا نہ کہنا ہی بہتر۔

وہ سمجھ نہیں رہا تھا کہ دوسرے پہلوان نے آخر کیوں ایسا ناسازگار رویہ اختیار کیا تھا۔

انہی خیالوں میں گم تھا کہ اس کی غضب آلود نگاہیں بلا ارادہ اس مغرور پہلوان پر گڑ گئیں جو امیر شہر کے سامنے تن کر کھڑا ہوا تھا۔

اس پہلوان نے جو میدان کارزار سے فاتح کی حیثیت سے باہر آیا تھا، یکبارگی کچھ کہا اور کچھ بولنا شروع کیا جس کی وجہ سے صرف شہر کا میدان ہی نہیں، سارا شہر ہی نہیں بلکہ یہ زمین و زمان بھی حیرت و تعجب میں ڈوب گیا۔ اس نے کہا: اے امیر شہر! صرف یہی میرا زور بازو نہیں! جو جوان مجھ سے پچھڑا ہے وہ تو بہت آسان تھا، اگر میرا استاد بھی کسی دن مجھ سے کشتی لڑے گا، میں اسے بھی میدان میں خاک پر لٹادوں گا۔ اگر میں نے اب تک اپنے استاد سے کشتی لڑنے کی جرأت نہیں کی ہے، اس کی وجہ اس بوڑھے استاد کی طاقت اور زورآوری کا ڈر نہیں ہے، بلکہ میں نے اس کی ناتوانی اور بڑھاپے پر رحم کھایا ہے۔

یہ باتیں سن کر، بوڑھے پہلوان کو احساس ہوا کہ گویا شہر کا میدان اس کے سر میں گھوم رہا ہے۔ اس نے نیلے رنگ کے آسمان پر ایک اندوہ بار نظر ڈالی۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ بھی اس کے سر پر گرنے والا ہے۔

بوڑھا پہلوان بستر پر بیمار و زار ونزار پڑا ہوا تھا۔ اور جو کچھ ایک دن پہلے اس کے ساتھ پیش آیا تھا، اس پر غور کر رہا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کا شاگرد یعنی وہی جوان پہلوان لوگوں کی بھیڑ کی تعریف وتوصیف کے نعروں اور امیر شہر کی تحسین آمیز نگاہوں کی وجہ سے مغرور ہوگیا تھا اور بس۔

اسے امید تھی کہ جوان پہلوان مقابلے کا ارادہ ترک کردے گا اور نفس کی اطاعت سے باز آجائے گا۔ آخر اس کشتی کا جو نتیجہ بھی نکلے، کسی کے لیے بھی باعث افتخار نہ ہوگا۔ اگر جوان پہلوان نے اپنے استاد کو پچھاڑ دیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، چوں کہ اس نے محض ایک بوڑھے شخص ہی کو تو شکست دی ہے۔ اور اگر بوڑھے پہلوان نے جوان پہلوان کو اکھاڑے سے باہر کر دیا، یہ بھی کوئی فخر کی بات نہیں اس لیے کہ سب ہی پیشہ ور پہلوان کہیں گے: پہلوان! تیرے دل نے یہ کیسے قبول کرلیا کہ ایک جوان کو شکست دے؟ اس نے بچپنا کیا، تجھے کچھ کہہ دیا، تو نے کیوں اس کو دل پر لے لیا؟

ایسی صورت میں بوڑھے پہلوان نے گھنٹوں اسی ادھیڑ بن میں گزار دیے یہاں تک کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلوان کی بیوی گئی اور دروازہ کھول دیا۔ پہلوان کا ایک شاگرد تھا اس نے سلام کیا اور اندر آ گیا۔

وہ پہلوان کے قریب آیا، مؤدب بیٹھ گیا اور کہا: پہلوان آپ سلامت رہیں! علی آپ کے یار و مددگار اور اللہ نگہبان، میں نے اس سرکش جوان سے کہا کہ اکھاڑے میں نہ اترے، اس سے درخواست کی، اس کے پیروں پر گر گیا، لیکن نہیں معلوم وہ کیوں بدل گیا ہے پہلوان! اس کے سر میں تو کچھ دوسرا ہی سودا سمایا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کشتی سے آخر کار تجھے خوشی نہیں ہوگی لیکن وہ کسی طرح باز نہیں آیا، مجھے نہیں معلوم..... میری تو عقل کسی طرح کام نہیں کر رہی ہے۔

بوڑھے پہلوان کا رنج و بیماری کی وجہ سے رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔اس نے کہا: ٹھیک ہے، ابھی لوہا گرم ہے! کل میں خود اس کے پاس جاؤں گا، ممکن ہے اگر میں خود گیا تو اس کا ذہن بدل جائے۔ جو کچھ بھی ہو، میری اور تیری طرح سینے میں اس کے بھی دل ہے۔کل تک کیا ہوگا، خدا ہی جانتا ہے، ممکن ہے وہ خود میرے پاس آئے اور کہے کہ اب اس کشتی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں بھی اس سے کہہ دوں گا: بیٹا جا، تو بالکل نہ گھبرا۔

وہ اس مغرور پہلوان کے دل کو نرم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ رنجیدہ خاطر بوڑھے پہلوان کے گھر سے باہر آ گیا۔اس بوڑھے نے دروازے پر آنکھیں گڑا دیں۔اپنے کان تیز کر لیے کہ ممکن ہے کوئی آواز سنائی دے، لیکن اگر دیوار سے آواز بلند ہوسکتی تو پھر پہلوان کے کانوں میں بھی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آ سکتی تھی۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، بوڑھا پہلوان پکے عزم کے ساتھ بستر بیماری سے اٹھا۔ کپڑے بدلے، سر پر ٹوپی رکھی، اور شہر کے خالی گلی کوچوں میں جو تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے چل دیا۔اس کا قصد تھا کہ خود اس مغرور پہلوان کے پاس جائے اور بے فائدہ مقابلے سے جو طے تھا شہر کے بڑے میدان میں ہو، اسے باز رکھے۔

شہر میں سناٹا تھا۔سب لوگ اکیلے میں اپنے گھروں میں یا تو آرام کر رہے تھے یا میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔مینڈک اس پانی کی دھیمی آواز میں جو شہر کے کوچوں کے باغوں میں بہہ رہا تھا، اپنے گنگنانے میں مصروف تھے، گویا وہ بوڑھے پہلوان کی تنہائی کے غم کو کم کر رہے ہوں۔

پہلوان اس وقت بخار میں تپ رہا تھا۔ بیماری سے گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ایک

کے بعد ایک محلے سے گذرا اور ایک گھر کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔لمحہ بھر سکوت رہا۔ پھر دور سے آتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

پہلوان نے اپنے حواس بجا کیے اور اس کے لیے آمادہ ہوگیا کہ جیسے ہی اس کا جوان شاگرد دروازہ کھولے گا، جلدی سے اسے نصیحت کرنا شروع کردوں گا۔ قدموں کی آواز بالکل دروازے کے قریب آ گئی۔ کسی نے پوچھا: کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟ یہ خود وہی تھا، جوان پہلوان، بوڑھے پہلوان نے جب ایک جانی پہچانی آواز سنی تو ایک لمحے کے لیے وہ سب کدورتیں بھول گیا۔اس نے مہربانی کے لہجے میں کہا: بیٹا میں ہوں! دروازہ کھول، مجھے تجھ سے کام ہے۔

جوان پہلوان نے بے اعتنائی سے پوچھا: کون ہے؟ بوڑھے پہلوان نے پھر اسی مہربانی کے لہجے میں کہا: بیٹا میں ہوں! پہلوان دروازہ کھول۔

جوان پہلوان نے، دروازہ کھولے بغیر، دروازے کے پیچھے ہی سے کہا: مجھے کوئی بات نہیں کرنی، پہلوان! تو سلامت رہے۔ہماری ملاقات شہر کے بڑے میدان میں ہوگی۔

بوڑھا پہلوان یہ باتیں سن کر کھول گیا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ سو رہا ہے یا بیدار ہے، اسے چکر سے آئے اور بے حال ہوکر زمین پر گر گیا۔

رات کی اس تنہائی میں نہ کسی نے اسے دیکھا اور نہ اس جوان پہلوان نے اس کی گفتگو سنی، لیکن شہر کے خاموش کھڑے درختوں نے اس کی دل شکنی کی گواہی دی۔ بوڑھا پہلوان جب ہوش میں آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ وقت اسی حال میں زمین پر پڑا رہا ہے۔جس طرح بھی ہوسکا اس نے اپنے آپ کو پھٹکارا اور زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے اپنے سر، چہرے اور لباس پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ آہستہ شہر کے گلی کوچوں کی راہ لی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے پہلوان کی حالت زار دیکھی اور تعجب کا اظہار کیا۔

وہ سمجھ گئی کہ کسی نہ کسی کام کی وجہ سے رنجیدہ خاطر ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے اور بھی رنجیدہ کرے، اس لیے منھ پر تالا لگالیا اور صبر کیا۔

پہلوان نے چاند کی روشنی میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا اور کہا: جاؤ اور میرے لیے چراغ لے آؤ۔ مجھے اسی وقت اس کی ضرورت ہے۔

پہلوان کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گئی اور جلدی سے چراغ اٹھا لائی۔ پہلوان نے اپنی بیوی کے ہاتھ سے چراغ لیا اور کہا: اب آرام سے جاؤ اور سو جاؤ میں کچھ دیر اپنے خدا کے ساتھ تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔

پہلوان کی بیوی نے نگاہ نیچی کی، اپنے شوہر کو دیکھا وہ اپنے شوہر کی ان حرکتوں پر تعجب کر رہی تھی، بہر حال وہ کمرے میں چلی گئی۔ پہلوان نے چراغ ہاتھ میں اٹھایا کمرے سے باہر نکل گیا اور صندوق خانے میں چلا گیا۔ اس نے چراغ کی مدھم روشنی میں ایک صندوق کا ڈھکنا کھولا۔

صندوق میں جس چیز نے سب سے پہلے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی، کشتی کا لباس تھا۔ اس نے نہایت افسوس و تکلیف میں اس پر نگاہ ڈالی اور کہا: اے خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میں بالکل راضی نہیں تھا کہ یہ لباس پہنوں اور اکھاڑے میں اتروں، لیکن نہیں معلوم اس کا سبب کیا ہے کہ وہ بیچارہ جوان مجھے اس پر مجبور کر رہا ہے کہ میں کشتی لڑوں۔ میں انہی چند دنوں میں یہ لباس پہنوں گا اور مقابلے کے میدان میں اتروں گا۔ اس دفعہ اور اس عمر میں ایسی صورت میں مقابلہ کروں گا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور حالات مجھے کس

مصیبت و بلا میں گرفتار کریں گے۔ اے خدا! جو کچھ بھی ہو، ایسا کرنا کہ وہ میرے لیے بھی اور اس بیچارے غرور کی قید میں گرفتار جوان کے لیے بھی خیر وخوبی کا باعث ہو۔

پہلوان نے اپنے خدا سے یہ کہا۔ کشتی کے اپنے لباس پر ایک نگاہ ڈالی اور صندوق خانے سے باہر آ گیا۔ اس درمیان اگر کسی نے اس کی یہ سرگوشیاں سنیں تو وہ مٹی کا دیا تھا جو آرام سے چپ چاپ اپنی روشنی بوڑھے پہلوان کے سامنے پھینک رہا تھا۔

شہر میں ایسا ہنگامہ اور شور شرابا برپا تھا کہ بس دیکھتے ہی بنے۔

سب بوڑھے جوان، چھوٹے بڑے شہر کے گلی کوچوں سے ایک کے بعد ایک گزر رہے تھے کہ شہر کے بڑے میدان میں پہنچ جائیں اور کشتی کا مقابلہ دیکھیں۔ بہر حال یہ کشتی دوسری کشتیوں سے بہت زیادہ مختلف تھی۔

پہلی بار ایسے دو پہلوان ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے جن میں ایک بوڑھا اور دوسرا جوان ہے۔ مزید برآن، یہ کشتی لڑنے والے استاد و شاگرد ہیں کہ یہ بھی اس شہر میں کبھی نہیں ہوا۔ بوڑھے پہلوان کے گھر میں جوانمرد، بوڑھے پہلوان کی مالش میں مشغول تھے۔ اس کے بوڑھے اور تھکے ہوئے جسم پر تیل مالش کر رہے تھے تا کہ اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو اور اس مقابلے کے لیے وہ زیادہ بہتر طور پر تیار ہو جائے۔ بالآخر بوڑھا پہلوان تیار ہو گیا اس نے یا علی کا نعرہ لگایا اور کچھ جوانمردوں کے ساتھ شہر کے بڑے میدان کی طرف چل نکلا۔ یہ لوگ جب وہاں پہنچے تو ہر طرف بھیڑ ہی بھیڑ دیکھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان و زمین ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں۔ پہلوان نے کشتی کا لباس پہنا اور آہستہ سے اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔

جس وقت بوڑھے پہلوان نے اکھاڑے میں پیر رکھا، طبلہ بجانے والوں نے طبلہ بجانا شروع کردیا اور ڈھول کی آواز نے سارا میدان سر پر اٹھالیا۔

بوڑھے پہلوان نے اکھاڑے کے بیچ میں کالی مٹی پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ اسی وقت جوان پہلوان دوسری طرف سے اکھاڑے میں اترا اور اس کی تنہائی کو درہم برہم کردیا۔

بوڑھے پہلوان نے مٹی سے نظریں اٹھائیں اور جوان پہلوان پر ڈالیں۔

وہ زبان بے زبانی سے اپنے شاگرد سے کہہ رہا تھا کہ اب بھی وقت ہے، آ اور اس بے فائدہ مقابلے سے درگزر کر۔

لیکن اس جوان پہلوان کا چوڑا چکلا سینہ اور اکڑی ہوئی گردن یہ کہہ رہی تھی کہ وہ کشتی لڑنے کا قصد رکھتا ہے، اکھاڑے سے باہر نہیں جائے گا، جب تک یہ مصیبت ختم نہیں ہوجائے گی۔ بوڑھے پہلوان نے زور سے ''یا علی'' کا نعرہ لگایا جس کی وجہ سے سارے میدان پر سکوت و خاموشی چھاگئی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ موت کی مٹی شہر پر بکھیر دی گئی ہو۔

چند لمحوں کے بعد، دونوں پہلوانوں نے صبر وسکوت کو اس سے زیادہ طول دینا جائز نہیں سمجھا اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔

بوڑھا پہلوان چہرے، سر اور گردن پر وار کرنا اور اس کے بعد کمر کا داؤں آزمانا چاہتا تھا۔ لیکن جوان پہلوان کو اپنے بازوؤں کی طاقت اور جوانی کے جوش پر اطمینان تھا۔ وہ ہر چند چیتے کی طرح حملہ کرتا اور کوشش کرتا کہ بوڑھے پہلوان کی پٹوں میں بیٹھ جائے اور اس کو جو اس طرح اس کے مقابلے میں کھڑا ہوگیا تھا، چشم زدن میں زمین سے اٹھا کر، اپنے سر کے اوپر گھما کر، پیٹھ کے بل کالی مٹی پر دے پٹخے۔

لیکن بوڑھا پہلوان اس کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ جس طرح وہ اپنی پہلوانی اور کشتی لڑنے کی تاریخ کے دوران اپنے شاگردوں سے زور کرتا رہا تھا، اور ان کو کبھی موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اس کو زیر کرسکیں، اسی طرح وہ جوان پہلوان کی اپنے مقصد میں کامیابی کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہا تھا۔ ان دونوں پہلوانوں کی کشتی سے اکھاڑے کی مٹی کا سکوت بھی درہم برہم ہوگیا اور لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میدان کے درمیان اکھاڑے کو گہرے گرد وغبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مقابلہ خوب گرم ہوگیا تھا جوان پہلوان اب بھی حملے کر رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھلا چکا تھا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، وہ بھول گیا تھا کہ اس وقت جس کے سامنے کھڑا ہے، وہ اس کا مرشد واستاد اور راہنما ہے۔ گرد وغبار کے درمیان، بوڑھے پہلوان کی نظریں جوان پہلوان کی آنکھوں پر پڑیں جن میں خون اترا ہوا تھا یہی نظر اسے برسوں قبل کے دور میں لے گئی۔

برسوں پہلے، یہ جوان پہلوان کہ اب ایک پہاڑ کی مانند اپنے استاد کے مقابلے میں کھڑا تھا، ایک نوجوان تھا۔ بوڑھے پہلوان کو چھونے سے اکھاڑے کی فضا بھی یاد آئی جس میں کالے دانے اور لوبان کا دھواں بھرا رہتا تھا۔ اس وقت وہاں اکھاڑے میں دو جوان پہلوان کشتی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک یہی پہلوان تھا جو فی الحال اس سے مقابلہ کر رہا تھا۔

یہ سب سوچ کر بوڑھے پہلوان کا دل دکھی ہوا کہ آخر اس کا ایک شاگرد کیوں اس قدر مغرور ہوگیا ہے۔ یہ جب اکھاڑے میں اترتا ہے، غرور وتکبر سے قدم اٹھاتا ہے، جیسے زمین اس کے پیروں کے تلے لرز رہی ہو۔

پہلوان اس غرور آمیز رویے سے پریشان تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک چیز اس شاگرد سے پنہاں رکھے۔ کشتی کا ایک فن ایک داؤ جو بظاہر بڑا سیدھا سادہ

تھا، لیکن تھا بہت کارساز۔ پہلوان اپنے خیالوں کی دنیا سے اب دوبارہ باہر آ گیا۔ وہ شہر کے بیچ میں بڑے میدان میں لوٹ چکا تھا۔

اس کے باوجود کہ اس کشتی اور کارزار سے اس کا دل خون ہو گیا تھا، لیکن اس نے اسی میں مسئلہ کا حل دیکھا کہ جوان پہلوان کی کمر مٹی پر دے مارے۔ اس نے ''یا علی'' کا زور سے نعرہ لگایا اور جوان پہلوان پر حملہ بول دیا۔

یہ ایسا حملہ تھا کہ جوان پہلوان پہلے تو اس حرکت سے بدحواس ہوا، لیکن پھر مسکرایا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بوڑھا شخص کر ہی کیا سکتا ہے کہ اس طرح حوادث کے دریا میں غوطہ لگا رہا ہے۔ جس وقت بوڑھے پہلوان نے جوان پہلوان پر حملہ کیا، کچھ ایسا ظاہر کیا کہ وہ کمر کا داؤ مارنے کا قصد رکھتا ہے۔

اسی وجہ سے جوان پہلوان نے خود کو آدھا گھمایا تا کہ جیسے ہی مناسب موقع ملے وہ بوڑھے پہلوان کو کوکھی میں بھر لے۔ اسی لحظہ بوڑھے پہلوان نے چشم زدن میں اڑنگی لگانے کا داؤ مارا اور پھر کیا تھا، قصہ ختم ہو گیا۔ غرور و جوانی کا ایک پہاڑ میدان کے بیچ میں گرد و غبار کے درمیان زمین سے الگ ہوا، اوپر اچھالا کھایا اور زمین پر آ رہا، وہ بھی کیا زمین پر گرنا تھا!

شہر کا بڑا میدان جو کشتی کی گرما گرمی میں، دو حریفوں کی زور زور سے ہا، ہو کی آوازوں سے ہمت بندھا رہا تھا، پھر ایک بار سکوت و خاموشی میں غرق ہو گیا۔

اب سب تماش بین اس انتظار میں تھے کہ میدان کے بیچ کا گرد و غبار بیٹھ جائے اور وہ حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں۔ مخصوصاً امیر شہر کی بری حالت تھی چوں کہ اس نے اپنی بے جا سرپرستی سے جوان پہلوان کو غرور و تکبر کے گرداب میں غرق کر دیا تھا۔

آخر کار چند لمحوں کے بعد جب آرام و سکون میدان میں لوٹ آیا، سب

نے دیکھا کہ جوان پہلوان کا جسم کالی مٹی پر پڑا ہوا ہے اور اس میں انتہائی اور بے حد وحساب ندامت، شرم وحیا سے اٹھنے کی طاقت بھی نہیں ہے، لیکن اسی حال میں ایک چیز نے شہر کے لوگوں کا دل لرزادیا۔ بوڑھے پہلوان نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ یہ معاملہ اس کے جھکے ہوئے کندھوں سے جولرز رہے تھے، اچھی طرح سمجھا جا سکتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ رونا، ذوق وشوق کا رونا نہیں ہے۔ اس لیے کہ بوڑھا پہلوان جس چیز کا بھی طلب گار تھا، پہلے ہی اسے مل چکی تھی۔

پھر اب وہ رو کیوں رہا تھا؟ شاید ایک جوان کی حالت پر جس نے غرور وتکبر کی وجہ سے بہت کچھ گنوا دیا تھا۔

☆☆☆

سمجھ دار لڑکی

اور ہاں سمجھ دار راویوں، تواں مند نقل کرنے والوں، پرانے قصے کہنے والوں، بات کہنے کے دشت کے ہوشیار سیاحوں نے بڑی ہمت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

برسوں پہلے اور قدیم زمانے میں، مشرق کی وسیع وعریض سرزمین کے ایک علاقے میں ایک حکیم (صاحب علم ودانش) رہتا تھا اس کا دل علم و دانائی کے نور سے روشن تھا۔ اس کو عقل وخرد سے بڑا وافر حصہ ملا تھا۔ اسی وجہ سے علاقے میں ہر شخص چھوٹا، بڑا، بوڑھا جوان اگر کسی مسئلہ یا مشکل سے دوچار ہوتا، وہ اسی عقل مند اور روشن بیں حکیم کے پاس آتا۔ اپنی مشکل اس سے بیان کرتا اور مطمئن ہوکر کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا۔

حکیم کی یہ عادت تھی کہ ہمیشہ، ہر جگہ، اجنبی اور آشنا سے اور سفر میں کبھی سیکھنے اور سکھانے سے باز نہ رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا نام و پتا اور راہ و رسم خاص و عام کی زبان پر تھے۔ حکیم کے ان احوال، رویے اور کردار کے باوجود شہر کے تمام لوگ اس کے انجام کی طرف سے فکر مند تھے۔ کیوں؟

ماجرا کچھ اس طرح ہے کہ حکیم کسی کے ساتھ زندگی گذارنے پر آمادہ نہیں تھا

اور بقول معروف وہ شادی نہیں کرتا تھا۔

ہر شخص اس سے شکایت کرتا: حکیم صاحب! آپ آخر ایک بزرگ شخص ہیں، ہمیں آپ کو نصیحت نہیں کرنی چاہیے..... آخر کب تک آپ تن تنہا زندگی گزاریں گے؟ آپ کو سمجھ لینا چاہیے، آخر کار بڑھاپا آئے گا بیماری ہے اور اور دوسری کلفتیں ہیں..... آپ آخر عمر تک اپنے گھر میں صرف اور صرف کتاب پڑھنے اور لکھنے ہی سے سروکار نہیں رکھ سکتے۔

حکیم صاحب جواب میں کہتے: میں ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جسے علم و دانش سے وافر حصہ ملا ہو۔ وہ عورتوں میں دوسروں سے زیادہ عقل مند ہو۔ اگر آپ حضرات ڈھونڈ سکیں تو مجھے خبر دیجئے گا۔

حکیم صاحب کی اس شرط کے مطابق اہل شہر نے شہر کی چند اہل، با حیثیت اور معروف عورتوں کا ان سے تعارف کرایا۔ لیکن حکیم صاحب جس قسم کی عقل مند عورت کی تلاش میں تھے، انہیں یہ عورتیں پسند نہیں آئیں اور وہ اسی انداز سے پہلے کی طرح تنہا زندگی بسر کرتے رہے۔

اہل شہر میں سے چند لوگوں نے جو ہمدردی کے طور پر حکیم سے شادی کرنے پر اصرار کرتے تھے، دیکھا کہ وہ اپنی بات پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں، تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تا کہ وہ جو چاہے کریں۔

سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے امید ہی چھوڑ دی کہ حکیم شادی کرلیں اور بعض خود یہ سوچنے لگے کہ: یقیناً یہ سب باتیں بے کار ہیں۔ حکیم اس طرح ہماری زبان بند کر رہے ہیں تا کہ پھر ان سے شادی کرنے کے لیے نہ کہیں ورنہ کیسے ممکن ہے، اس بڑے سے شہر میں حکیم کی پسند کی لڑکی ناپید ہو؟ لڑکیوں کا کوئی قحط پڑ گیا ہے۔

یہی حالات تھے اور اسی طرح وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ ایک روز حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ گھومنے اور تفریح کرنے اور اس طرح زندگی کے تجربوں سے کچھ حاصل کرنے، سفر پر نکل جائیں اور کچھ دن کے لیے اپنے شہر سے کہیں دور چلے جائیں۔

اسی خاطر انہوں نے سفر کا مختصر سا سامان فراہم کیا اور شہر کے دروازے سے پا پیادہ باہر نکل گئے۔ خدا کے بنائے ہوئے بیابانوں سے گذرتے گئے گذرتے گئے۔

حکیم نے ایک مدت تک تن تنہا اپنا سفر جاری رکھا۔ ان کے دل میں آرزو جاگی، کاش میری بیوی ہوتی اور میں اکیلے سفر کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔

وہ ابھی اسی ادھیڑبن میں تھے کہ یکبارگی اپنے پیچھے سے قدموں کی آواز سنی۔ انہوں نے سر پیچھے موڑا اور دیکھا کہ ایک شخص کندھے پر تھیلا ڈالے ان ہی کی طرح پا پیادہ راستہ طے کر رہا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوئے۔ آہستہ چلنے لگے اور پھر رک گئے تاکہ وہ شخص ان تک پہنچ جائے۔ آخر کار جلدی ہی وہ اجنبی ان تک پہنچ گیا اور حکیم کو دیکھ کر خوش ہوا اور سلام علیک کہا، حال چال پوچھے صحت وسلامتی کے بارے میں سوال کیا، حکیم نے دل ہی دل میں کہا: ''اب اندازہ لگانا چاہیے کہ یہ میرا ہم سفر کس قدر ہوشیار اور چالاک ہے، میں کب تک اور کہاں تک اس کے ہمراہ سفر کرسکتا ہوں۔ حقیقتاً یہ اس قابل بھی ہے کہ اس کے ساتھ سفر کیا جاسکے؟ یہی وجہ تھی کہ حکیم نے ان کی طرف رخ کیا اور پوچھا: ''خوب، اب دیکھتے ہیں کہ اس سفر میں تو مجھ پر سوار ہوگا یا میں تجھ پر؟''

اس اجنبی شخص کو حکیم کی باتوں پر تعجب ہوا۔ اس نے کہا: یہ آخر ہے کون جو آج میرا ہم سفر ہوگیا ہے؟ کیا ہم ایک دوسرے کے لیے لدّو جانور ہیں؟ بات یہ ہے کہ اگر تو مریض و ناتوان بھی ہو، میں کسی بھی طرح تجھے اپنی پیٹھ پر سوار نہیں

کرسکتا..... میں تو اپنا یہ ہلکا پھلکا تھیلا بھی اپنے کندھے پر نہیں اٹھا سکتا، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص بھی میرے اوپر سوار ہو جائے۔

جب حکیم متوجہ ہوا کہ وہ شخص ان کی بات نہیں مان رہا، تو کہا: ٹھیک ہے، میرے ہم سفر! تو پریشان نہ ہو۔ میں جس طرح بھی ہوگا اپنا سفر جاری رکھوں گا اور اس سلسلے میں تجھ سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں۔ آؤ اب چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہماری کیا حالت ہوگی اور ہم پر کیا بیتے گی۔

حکیم کا ہم سفر چلتا رہا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا: عجب زمانہ آ گیا ہے، جہلا کا سا کام کرنا چاہتا ہے اور جب میں تیری بات مان ہی نہیں رہا تب بھی تو یہ کہتا ہے کہ اصلاً پریشان نہ ہوں..... ٹھیک ہے میں اب بالکل پریشان نہیں ہوں..... میں اس وقت پریشان ہوں گا جب تیری باتوں پر عمل کروں گا۔

حکیم نے اپنے ہم سفر کی سرزنش کا کوئی جواب نہیں دیا اور مسکرانے لگا۔ وہ چلتے رہے، چلتے رہے۔ حالاں کہ ایک لمبا راستہ ان کے سامنے تھا اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی فکر میں غرق تھا۔

ہاں، حکیم اور ان کے ہم سفر نے دو ایک دن اپنا سفر جاری رکھا اور چند منزلوں سے گذر گئے یہاں تک کہ وہ بالآخر ایک زمانے تک پانی اور آبادی سے دور رہنے کے بعد، ایک کھیت پر پہنچ گئے۔

اس کھیت میں سنہری گیہوں اپنے بھاری خوشوں میں ٹھنڈی ہوا کے باعث ادھر ادھر جھوم رہے تھے، اس طرح کہ ہر دیکھنے والا خاص طور پر اگر وہ اجنبی ہے، گیہوں کا یہ کھیت دیکھ کر ذوق وشوق میں جھومنے لگتا تھا۔

ہمارے ان دونوں مسافروں پر بھی یہی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ گیہوں کے کھیت کا نظارہ کرنے اور اس کی تعریف کرنے لگے۔

حکیم کے ہم سفر نے جیسے ہی کھیت دیکھا، کہنے لگا: میں نے آج تک گیہوں کا ایسا کھیت نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس تمام نعمت کے مالک پر رشک آ رہا ہے! اور اے میرے ہم سفر! کیا تو نے ابھی تک گیہوں کا ایسا کوئی کھیت دیکھا تھا؟

معلوم تھا کہ حکیم بھی گیہوں کے کھیت کی سرسبزی دیکھ کر جھوم اٹھا تھا، اس نے ایک بامعنی نگاہ کھیت پر ڈالی اور کہا: بہت اچھے، واقعی یہ کھیت دیکھنے کے قابل ہے..... سچ یہ ہے کہ یہ سرسبزی دیکھنے سے میرے جسم سے طویل مسافرت کی تھکن دور ہوگئی، لیکن کاش ہم یہ جان سکتے کہ آیا اس کھیت کے مالک نے بھی یہ بہت اچھے گیہوں کھائے ہیں یا نہیں؟

اجنبی شخص سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ یہ باتیں خواب میں تو نہیں سن رہا، اس نے حکیم کو تعجب سے دیکھا اور کہا: اے ہم سفر! تو نے کیا پوچھا؟ جو کچھ میں نے سنا ہے کیا وہ صحیح ہے؟

حکیم نے اسی لاپروائی سے جواب دیا: ہاں میں نے پوچھا ہے کہ کاش یہ معلوم ہوسکتا کہ گیہوں کے اس کھیت کے مالک نے بھی یہ گیہوں کھائے ہیں یا نہیں؟

اجنبی نے یہ جملے دوبارہ سنے اور ایک آہ بھری اور کہا: آپ نے یہ کیا سوال کیا؟ میں دیوانہ ہوگیا ہوں یا تم؟ ابھی تو گیہوں کاٹے ہی نہیں گئے، تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے مالک نے ان میں سے کچھ کھائے ہوں؟

حکیم نے جواب دیا: ہم سفر! ٹھیک ہے، تو دکھی ہوا، لیکن آپے سے باہر نہ ہو، اگر تجھے معلوم نہیں کہ کھیت کے مالک نے اس کے گیہوں کھائے ہیں یا نہیں، تو بس یہ جواب دے کہ میں نہیں جانتا، انسان کو ہر سادہ سی بات پر دکھی نہیں ہونا چاہیے۔

ہم سفر نے جو حالاں کہ ابھی اس طرح دکھی اور غصے میں تھا کہا: کیسے دکھی نہ

ہوں؟ تو یہی سوال کسی دوسرے شخص سے پوچھ کر دیکھ، اگر وہ تجھ پر نہ ہنسے اور یہ نہ کہے کہ تو بے عقل ہے۔

حکیم نے اجنبی کو راحت کی سانس لینے کی ہدایت کی اور کہا: چلو اب تم اتنے دکھی ہو چکے تو میں گندم کے اس کھیت کے سلسلے میں تم سے کوئی مزید سوال نہیں کروں گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گیہوں کے اس کھیت کو دیکھنے سے لمبی مسافرت کی تھکن تیرے جسم سے بھی دور ہو چکی ہے۔ اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے کہ پھر سے آمادہ ہو جائیں اور اپنا سفر جاری رکھیں۔

حکیم کے ہم سفر نے ایسی صورت میں کہ اگر اس کے چھری بھی ماردی جاتی تو خون نہ نکلتا، اپنا تھیلا دوبارہ اپنے کندھے پر رکھا اور کہا: اے کاش شروع ہی میں ہم نے اپنی راہ لی ہوتی اور بغیر کچھ کہے سنے گیہوں کے اس کھیت سے گزر گئے ہوتے۔ اس عجیب وغریب سوال کی وجہ سے جو تو نے مجھ سے پوچھا ہے، نہ صرف یہ کہ تھکن نہیں اتری بلکہ میری تھکن اور کوفتگی دوبالا ہوگئی۔ ٹھیک ہے، اس سے پہلے کہ تو پھر مجھ سے عجیب وغریب سوال کرے، بہتر ہے اپنی راہ لیں تا کہ میں جس قدر ہو سکے جلدی اپنے گھر پہنچ سکوں۔ اس کے بعد یہ دونوں مسافر گیہوں کے کھیت کے قریب سے گزر گئے اور اپنی راہ لی۔ وہ کچھ گھنٹے ہی چلے ہوں گے کہ انہیں بھوک لگنے لگی۔

حکیم نے اپنے ہم سفر کی طرف دیکھا اور کہا: اے بندۂ خدا! اگر تو اس سے متفق ہو تو کہیں ایک گوشے میں بیٹھ جائیں اور ایک روٹی کھالیں اور پھر اپنا سفر جاری رکھیں۔

اجنبی شخص نے کہا: کتنی عجیب بات ہے اس بار تو نے عجیب وغریب سوال نہیں کیا، جو کچھ تو کہہ رہا ہے ٹھیک ہے، لیکن ذرا صبر کر، صحرانشینوں کے خیموں

تک پہنچ جائیں پھر کھانا کھائیں گے۔

اس گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ دور سے کچھ خیمے نظر آئے۔ وہ جب قبیلے کے خیموں تک پہنچے تو اپنا دسترخوان بچھادیا۔ وہ کھانا شروع کرنا چاہتے تھے کہ اجنبی شخص نے پانی کی وہ مشک کو جو اس کے ساتھ تھی، زمین پر رکھی اور کہا: دیکھو! مشک میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں، اس لیے میں نے کہا تھا کہ چلو پہلے کسی خیمے اور خرگاہ تک پہنچ جائیں پھر کھانا کھائیں گے۔

وہ شخص اس کے بعد کھڑا ہوا اور ان خیموں میں رہنے والوں سے پانی لینے چلا گیا لیکن وہ جیسے ہی ایک خیمے کے سامنے پہنچا، رونے کی آواز سنی، وہ اس وجہ سے وہاں منتظر کھڑا نہیں رہا بلکہ حکیم کے پاس لوٹ آیا۔

حکیم نے پوچھا: اے ہم سفر! خالی ہاتھ کیوں لوٹ آیا، کیا وہاں پانی نہیں ہے؟

حکیم کے ہم سفر نے جواب دیا: مجھے نہیں معلوم، وہاں سے رونے کی آواز آرہی تھی، میں نے پانی مانگنا مناسب نہیں سمجھا، جو کچھ ہمارے پاس ہے وہی کھالیتے ہیں اور یہاں سے جلدی ہی روانہ ہوجاتے ہیں۔

اس گفتگو کے بعد حکیم اور اس کے ہم سفر نے دسترخوان بچھایا اور کھانا کھانے لگے۔ انہوں نے کھانا کھالیا۔ کچھ آرام کیا۔ وہ اپنا کام اور سفر شروع کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تو اچانک دیکھا کہ ایک خیمے سے ایک تابوت باہر لایا گیا اور کچھ عورتیں مرد، چھوٹے بڑے روتے اور سر پیٹتے ہوئے اس تابوت کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی تو حکیم نے کہا: اے ہم سفر! ہمیں ذرا رک کر اپنی راہ لینی چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ ہمیں جانے سے پہلے مردے کے ساتھ چلنے والوں کے ہمراہ چلنا اور پھر اپنا راستہ پکڑنا چاہیے۔

جب اجنبی نے محسوس کیا کہ حکیم صحیح بات کہہ رہا ہے تو اس نے بھی یہ بات

مان لی اور میت کے ہمراہ چلنے والوں کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ میت کے ساتھ چند قدم چلے۔ اسی اثنا میں انہوں نے خیمے میں رہنے والوں میں سے ایک کی مدد سے اپنی مشک پانی سے بھری اور پھر اپنی راہ لی۔

ہم سفر نے جب چلنا شروع کیا تو اس نے حکیم کی طرف دیکھا اور کہا: بہت جلدی ہی اس سفر کا مشکل دور ختم ہونے والا ہے۔ حکیم نے پوچھا وہ کیسے؟ کیا معلوم ہے کہ ہم کسی مقام پر پہنچنے والے ہیں؟

اجنبی نے جواب دیا: یہ قبیلہ ہمارے قبیلے تک پہنچنے کے راستے میں آخری منزل ہے۔ ہم جلدی ہی اپنے قبیلے کے خیموں تک پہنچنے والے ہیں۔

حکیم کو خوشی ہوئی اور اس نے کہا: ٹھیک ہے خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اب تک اپنا سفر سلامتی کے ساتھ طے کرلیا لیکن مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔ امید ہے کہ تو میرے سوال کا جواب دے سکے گا۔ وہ اجنبی اب بھی حکیم اور اس کے سوالوں کے بارے میں مشکوک تھا۔ اس نے کہا: اگر تیرے سوال پہلے ہی کی طرح ہیں، تو میں یقیناً جواب نہیں دے سکوں گا۔

حکیم نے کہا: میں اس خاطر تجھ سے سوال کر رہا ہوں کہ تو نے کہا کہ تیرا قبیلہ اس قبیلے کے نزدیک ہے۔ اب بتا کہ وہ شخص جو تابوت میں تھا، مردہ تھا یا زندہ؟

حکیم کا ہم سفر یہ بات سن کر حیران ہوگیا اور اس نے کہا: پھر تو نے مجھ سے عجیب وغریب سوال کیا؟ اگر مجھے اب تک اس میں شک تھا کہ تو دیوانہ ہے، تو اس کے بعد اب مجھے یقین ہوگیا کہ تو عقل سے پیدل ہے۔

حکیم کے ہم سفر نے یہ بات کہی اور چوں کہ وہ اپنے ہمراہی سے وحشت زدہ ہوگیا تھا، اس نے بھاگنا شروع کردیا۔

حکیم اپنے ہم سفر کے اس رویے سے بھونچکا رہ گیا اس نے پکار کر کہا:

ارے کہاں بھاگ رہا ہے؟ ٹھیک ہے اتنا کہہ دے کہ میرے سوال کا جواب تو نہیں جانتا..... اس میں غصہ ہونے اور فرار ہونے کی کونسی بات ہے۔

حکیم کے ہم سفر نے جواب دیا: اب میرے قبیلے تک پہنچنے میں زیادہ فاصلہ نہیں بچا ہے..... میں جلدی جلدی جا رہا ہوں تا کہ جلدی پہنچ جاؤں اور اس طرح تیرے عجیب وغریب سوالات کے شر سے محفوظ ہو جاؤں۔

اس شخص نے یہ جواب دیا اور اپنی راہ پکڑی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے قبیلے تک پہنچ گئے۔ وہ حکیم سے پہلے ایک خیمے میں پہنچ گیا اور اس نے اپنے تھکے ہارے جسم کو اس خیمے میں دراز کر دیا۔ اسی اثنا میں خیمے میں رہنے والے شخص کی لڑکی نے اپنے والد کی حالت زار دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا والد صاحب! آخر بات کیا ہے؟ آپ نے خیمے میں اپنے آپ کو اس طرح ڈال دیا ہے گویا کسی درندے جانور کے پنجوں سے رہائی پائی ہو!

اس شخص نے کہا: اگر کسی درندے جانور کے جال میں بھی پھنس گیا ہوتا تب بھی میری بیٹی میں اس قدر دکھی اور پریشان نہ ہوا ہوتا۔ مجھے اس سفر میں ایک دیوانے کی ہمراہی و ہمقدمی سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ جس کی مثال صرف اور صرف قصوں میں ملتی ہے۔ اب جلدی کرو اور اس شخص کو جو خیمے کے باہر کھڑا ہے، کھانا دے دو۔ وہ کھائے اور چلا جائے۔ مجھ میں اس سے زیادہ اس کا منھ دیکھنے کی طاقت نہیں ہے۔ بیٹی چلو جلدی کرو!

لڑکی اپنے والد کی یہ بے قراری اور اضطراب دیکھ کر تعجب میں پڑ گئی تھی، اس نے پوچھا: آپ ایک دیوانے کے ہم سفر تھے؟ آپ نے کس طرح یہ سفر طے کیا؟ آپ کو ڈر نہیں لگا؟ اگر راستے میں وہ کسی بلا کا باعث ہو جاتا تو پھر آپ کیا کرتے؟

صحرانشین نے کہا: بیٹی! میرا ہم سفر اس طرح کا دیوانہ نہیں ہے۔ وہ لڑاکو اور جھگڑالو بھی نہیں ہے..... اگر میں کہہ رہا ہوں کہ دیوانہ ہے، اس کے عجیب و غریب سوالات کی وجہ سے کہہ رہا ہوں جو اس نے مجھ سے سفر کے دوران کیے..... ایسے سوال جو کوئی بھی عقلمند شخص نہیں کرتا۔

لڑکی نے پوچھا: ان چند سوالات کی وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تمہارا ہم سفر دیوانہ ہے؟ اچھا، اس نے راستے میں کیا سوال کیے؟ اس کے بعد، اس صحرانشین نے حکیم کی زبان سے جو کچھ سنا تھا، اپنی لڑکی سے بیان کر دیا۔ جوان لڑکی نے جب یہ باتیں اپنے والد سے سنیں، ہاتھ پر ہاتھ مارا اور کہا: والد صاحب! دیکھا آپ نے کیا کام کیا ہے؟ یہ سوالات تو اس شخص کی عقل و دانائی کی علامت ہیں۔ وہ ان سوالات سے آپ کے مبلغ علم و دانش کا اندازہ لگا رہا تھا۔ آپ اب جلدی کیجیے، جایئے اور اس بندۂ خدا سے معذرت کیجیے اور اسے عزت و احترام کے ساتھ خیمے میں لایئے۔ وہ جب تک چاہے ہمارا مہمان رہے۔

صحرانشین نے کہا: بیٹی بڑی عجیب بات کر رہی ہو۔ آخر مجھے کم از کم یہ بتاؤ کہ ان سوالات کے معنی کیا تھے تا کہ میں اطمینان کے ساتھ اس شخص کے پاس جاؤں۔

لڑکی نے کچھ سوچا اور پھر کہا: اس نے جو پہلا سوال کیا تھا، یہ تھا کہ اس سفر میں تو مجھ پر سوار ہوگا یا میں تیری پیٹھ پر بیٹھوں گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راستے میں، تو میرے لیے کوئی حکایت بیان کرے گا، یا میں تجھے کوئی قصہ سناؤں گا۔ چوں کہ لمبے سفر میں اگر کوئی اپنے ہم سفر اور ہمراہی کے لیے کوئی قصہ کہانی نقل کرتا ہے تو وہ اس کے جسم سے سفر کی تکلیف کو رفع کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس نے اسے اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا ہو..... اس کے بعد جب آپ گیہوں کے کھیت پر پہنچے، تو اس نے آپ سے پوچھا کہ آیا اس کھیت کے مالک نے اس

کے گندم کھائے بھی ہیں یا نہیں؟ اس کا مقصد و مطلب یہ تھا کہ اس کھیت کا مالک مقروض اور پریشان تو نہیں کہ گیہوں کاٹنے کے بعد مجبور ہو جائے سب کچھ اپنے قرض خواہوں کو دے دے۔ چوں کہ اگر معاملہ یہ ہے تو درحقیقت اس نے پہلے ہی سے وہ روپیہ پیسہ جو ممکن ہے گیہوں بیچنے کے بعد اس کو ملے، کھا چکا ہے یا اس کے بقول گیہوں اس نے کاٹنے سے پہلے ہی کھا لیے ہیں۔

باپ نے سر ہلایا اور کہا: ٹھیک اس کے تیسرے سوال کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟ کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ وہ مردہ جسے تابوت میں رکھ دیا گیا ہے، زندہ ہے یا مردہ، اس کے پاس عقل ہے کہ نہیں؟

لڑکی نے اپنے والد سے کہا کہ وہ پرسکون رہے اور کہا: والد صاحب نہیں۔ یہ سوال بھی بامعنی تھا۔ اس نے آپ سے پوچھا تھا کہ زندہ ہے یا مردہ اس کا مطلب یہ تھا کہ آیا یہ مرد عالم تھا کہ نہیں؟ اگر عالم تھا، پس ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آیا اس کی آس اولاد اس کے بعد اس کی یادگار ہے جو اس کے نام کو زندہ رکھے؟ اور اگر اس کی اولاد نہیں تھی، آیا اس نے کوئی کار خیر کیا، یا صدقۂ جاریہ دیا کہ جس کی وجہ سے اس کا نام زندہ رہ سکے؟ اگر کوئی اپنی زندگی ہی میں کوئی کار خیر انجام دیتا ہے وہ لازمی طور پر اپنی موت کے بعد بھی زندہ ہے۔ اگر کوئی جاہل ہے اور اس نے کوئی اچھا کام بھی انجام نہیں دیا، وہ اس دنیا میں اپنی زندگی ہی میں ایک مردے سے زیادہ نہیں۔

صحرانشین نے جو اپنی لڑکی کی دانائی کی ان تمام باتوں سے جھوم اٹھا تھا، کہا: بیٹی اب میں کیا کروں؟ اس شخص سے کیا کہوں؟

سمجھ دار لڑکی نے کہا: جلدی کیجیے، جایئے، اس کے سوالات کا جواب دیجیے تا کہ وہ آپ کو جاہل اور نادان نہ سمجھے فی الحال یہ سب سے اہم کام ہے جو آپ

کوانجام دینا چاہیے۔

صحرانشین نے اپنی لڑکی کی زبان سے یہ باتیں سنیں اور اس کے بعد، اس صورت میں کہ اس کے چہرے پر خجالت اور شرمندگی کے آثار نمایاں تھے، خیمے سے باہر گیا اور حکیم کے پاس پہنچا اور سر جھکائے ہوئے اس سے کہا: حضور والا! چند روز سے میں متفکر اور پریشان حال تھا۔ اسی وجہ سے میں آپ کے سوالات کے جواب نہیں دے سکا۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ میں نے اپنے دانا ہم سفر کو نادان کہہ دیا۔ اب آیا ہوں کہ آپ کے ان سوالات کا جواب دوں اور عرض کروں کہ آپ جب تک چاہیں، ہمارے مہمان رہ سکتے ہیں۔

حکیم بڑے سکون سے مسکرایا اور کہا: صحیح، بندۂ خدا تو نے بڑی جوانمردی کا ثبوت دیا ہے اور مجھ سے خواہش کی ہے کہ جب تک چاہوں یہاں رہ سکتا ہوں، میں تیرا دعا گو ہوں، لیکن اب ایک سوال ہے..... اب کہ تو مجھ سے اس حد تک ہمدل و یکدل ہوگیا ہے، یہ بتا کہ میرے سوالات کے جوابات تجھ کو بتائے کس نے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ان سوالات کا جواب دینا تیرے بس کی بات ہے..... اس میں کیا عیب ہے۔ ایک شخص بعض اوقات کچھ چیزیں نہیں جانتا، وہ ان کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ میں بھی ایسے بہت سے سوالات ہیں جن کے جوابات نہیں جانتا۔ ان کے جوابات ایسے لوگوں سے دریافت کرتا ہوں جو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، آخر ساری چیزی سب لوگ تو جانتے نہیں۔

حکیم کی ان باتوں سے صحرانشین کے دل کو تسلی ہوئی۔ اس نے کہا: سچ یہ ہے کہ ان سوالات کے جوابات میں نے اپنی لڑکی سے معلوم کیے ہیں..... وہ میری بہت سی پریشانیوں میں مشکل کشا ہے۔ حکیم نے جب یہ باتیں سنیں تو بہت خوشی سے خیمے میں داخل ہوگیا۔ کھانا کھانے کے بعد، اس نے سب سے پہلا کام یہ

کیا کہ اس سمجھ دار لڑکی کا ہاتھ مانگ لیا۔

وہ سمجھ دار لڑکی جانتی تھی کہ اس دنیا میں سب سے بڑا سرمایہ دانائی اور پرہیز گاری ہے، اس نے حکیم کی تجویز منظور اور اس سے شادی کر لی اور انہوں نے پھر سالہا سال اس دنیا میں خوشی اور مسرت سے زندگی گزاری۔

کیا کہنے ہیں ان کے، جن کے دل علم و دانش کے نور سے روشن ہوں۔

☆☆☆

دو مسافر

برسوں پہلے پرانے زمانے میں ایک شخص تھا، نام تھا اس کا کمال الدین ۔اس نے ایک زمانے تک کام کیا، محنت کی اور پھر خانۂ خدا کی زیارت اور حج کا ارادہ کیا۔

اس نے سفر کا انتظام کیا۔ جو کچھ اس کے پاس تھا اسے ایک گوہر میں بدلوالیا تا کہ اسے آرام سے اپنے ساتھ لے جا سکے۔اس کے بعد اس نے اپنے دوستوں، آشناؤں ،قوم، رشتے داروں، اور خاندان والوں سے خدا حافظی کی۔ ان سے خطاؤں کی معافی طلب کی اور سفر شروع کر دیا۔

کمال الدین حج پر گیا، صحیح سلامت مراسم حج ادا کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔

کمال الدین اب حاجی کمال الدین ہوگیا تھا۔اس کے پاس ایک گوہر تھا۔ وہی گوہر جو سفر شروع کرتے وقت وہ اپنے ہمراہ لایا تھا۔ ہاں، پرانے زمانے میں حمل و نقل آج کی طرح آسان نہیں تھی۔ چور اچکے راستے میں موڑ پر گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے اور مسافروں پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔اور ان کے پاس جو کچھ ہوتا اسے لوٹ لیتے تھے۔

اس خاطر بعض مسافر جو مجبور ہوتے تھے کہ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لے

جائیں، اسے موتی یا دوسرے قیمتی پتھروں میں تبدیل کرلیا کرتے تھے اور اس طرح سفر پر چل دیتے تھے۔ کمال الدین اپنے کارواں کے ساتھ لوٹنے کے لیے خوش وخرم آمادہ تھا۔ کارواں ایک آبادی اور پانی کے قریب پہنچا۔

اہل کارواں کے ہونٹ پیاس اور گرمی کی شدت سے پھٹنے لگے تھے۔ وہ سب باہم ایک ہی بار پانی پر ٹوٹ پڑے۔

اسی درمیان حاجی کمالدین کو اچانک اپنے گوہر اور اس ڈبیہ کی یاد آ گئی جس میں اسے رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈبیہ کو اپنی انٹی سے باہر نکالا اور اسے اپنے ہاتھ کے ایک گوشے پر رکھا۔ اس نے اپنا منہ ہاتھ دھویا اور پیاس بجھائی اور پھر سے اسے انٹی میں رکھ لیا۔

کمال الدین دوسرے مسافروں کی طرح تھک گیا تھا، پیاسا تھا، پانی کو دیکھنے میں غرق ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا اور اپنے کارواں کے ساتھ دوبارہ سفر پر چل پڑا تا کہ اپنے ملک اور شہر پہنچ سکے۔

کمال الدین کارواں کے ساتھ چلا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ہلکے ہوگئے ہیں سوچ بھی سکتے ہو کہ وہ بندۂ خدا کس اتفاق سے دوچار ہوگیا تھا؟ کمال الدین کو معلوم ہوا کہ وہ ڈبیہ جس میں قیمتی موتی تھا موجود نہیں۔

وہ اس طرف دوڑا۔ اُس طرف ڈھونڈا، ڈبیہ کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ بالآخر جب وہ سمجھ گیا کہ ڈبیہ اس نے کہاں چھوڑی ہوگی، سر پیٹتا، پریشان حال، وہ اس حوض کے کنارے واپس آیا جہاں کارواں کچھ دیر آرام کی خاطر رکا تھا۔

ہاں، اگر تم اس کا چہرہ بشرہ دیکھتے تو بھی پتا چل جاتا کہ اس کو موتی نہیں ملا۔ بالآخر جب معاملہ یہاں تک پہنچا اور یہ صورت حال پیش آ گئی، تو حاجی کمال الدین غم وافسوس سے بھرے دل کے ساتھ اپنے گھر بار کی طرف چل پڑا۔

مختصر یہ ہے کہ ایسے حوادث سے دوچار ہونے کے بعد جن کا برداشت کرنا تمہارے حوصلے سے باہر ہے، کمال الدین اپنے گھر پہنچا اور دو تین دن بعد جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی، تو اس نے سارا معاملہ اپنی بیوی سے بیان کردیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کمال الدین کی بیوی ایک با ایمان عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور کہا: ٹھیک ہے، بہر حال جو کچھ ہوا وہ تیری قدرت اور توانائی سے باہر تھا۔ جو کچھ بیت گیا اس پر افسوس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود تو سلامتی کے ساتھ حج پر جاسکا اور اسی طرح ٹھیک ٹھاک گھر لوٹ آیا، یہ خود شکر کی بات ہے..... ان شاء اللہ محنت اور کوشش سے یہ کھویا ہوا موتی دوبارہ حاصل ہوجائے گا۔ تو بس خدا پر توکل کر، وہی اپنے بندوں کو مشکلوں اور پریشانیوں سے نجات دلانے والا ہے۔

ہاں اس واقعہ کے دوسرے دن، کمال الدین نے ہمت کی اور شہر میں کام میں مشغول ہوگیا۔ خوب محنت کی یہاں تک کہ وہ جب تھک ہار کر گھر لوٹتا، اس میں تاب وتوانائی نہ ہوتی، تھک کر چور ہوتا، اس حال میں جو کام بھی کرتا، اس کے ہاتھ کچھ زیادہ نہ لگتا، آخر کار جو کچھ اس کے پاس تھا، اور جو کچھ اس نے بچایا تھا، وہ سب برباد کردیا۔

یہی وجہ تھی کہ کچھ مدت بعد قرض خواہ آنے لگے۔

طلب گار آتے اور پیسے مانگتے۔ لیکن ان میں کم ہی لوگوں کو کمال الدین سے کچھ حاصل ہوتا۔ اس لیے کہ آہوں میں گرفتار یہ شخص نالوں کا سودا کیا کرتا۔

کچھ وقت تک یہی ہوتا رہا۔ ایک روز اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اس حال میں کہ غم واندوہ اور کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا: بیوی! تم نے دیکھا کہ میں کس حالت زار میں

مبتلا ہوں، اگر سچ پوچھو تو میں یہ صورت حال اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے۔ آخر کب تک، مشکل سے ایک سانس لوں اور میری نظریں طلب گاروں کی آنکھوں سے دوچار ہوں اور میں شرمندگی سے سر جھکالوں۔ کمال الدین کی بیوی نے پوچھا: ٹھیک ہے کیا ہمارے سامنے کوئی اور راستہ بھی ہے۔ مجھے بتاؤ اب ہم کیا کریں؟

کمال الدین مشکلوں کی وجہ سے کومگو کی حالت میں تھا۔ اس نے کہا: بس اب بہت ہوا۔ جتنی خواری اور شرمندگی اٹھانی تھی اٹھالی، اس سے زیادہ بس کی بات نہیں..... اب جلدی کرو اپنا ساز و سامان جمع کرو، ہمیں اس شہر سے چلے جانا چاہیے۔

عورت نے جواب دیا: آخر کہا جائیں؟ پھر روپے پیسے اور لوگوں کے قرض کا کیا ہوگا؟ جن کا ہم پر قرض ہے، وہ ہماری ناداری پر ہمیں مار ڈالیں گے۔

کمال الدین نے کہا: میں شرم وخجالت کی وجہ سے اس شہر سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ قرض خواہوں کی لڑائی جھگڑے کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کہ جس قدر ہو سکے ہمیں روپیہ پیسہ حاصل کرنا چاہیے۔ اور خود کو لوگوں کی دینداری کے بوجھ سے نجات دلانی چاہیے۔

بالآخر کمال الدین اور اس کی بیوی نے مختصر سا ساز وسامان اکٹھا کیا اور کسی اجنبی شہر کا راستہ لیا اور چلے گئے۔

ہاں کمال الدین اور اس کی بیوی چلتے رہے چلتے رہے یہاں تک کہ کچھ دن بعد وہ ایک شہر پہنچے۔ کیا شہر تھا، ایک اجنبی شہر اور بہت دور، انہوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا، کس وقت پہنچے؟ بہت رات گئے، جس وقت سب چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان خواب خرگوش میں مگن تھے۔

یہ عورت مرد، شہر کے کوچوں، گلیوں اور محلوں میں حیران و سرگردان تھے کہ کوئی ٹھکانا اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ اچانک کمال الدین کی بیوی بے قرار ہوگئی اور رونے دھونے لگی۔

کمال الدین پریشان ہوگیا۔ اس نے پوچھا: بھاگوان کیا ہوا؟ تو نے بھی اس کام کے لیے یہی وقت چنا ہے؟

کمال الدین کی بیوی اسی طرح نالہ وزاری کرتی رہی، روتی رہی اور کہا: اے انسان تیرے حواس باقی ہیں کہ نہیں؟ مگر تجھے معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ خداوند ہمیں جلد ہی ایک اولاد سے نوازے گا۔

کمال الدین نے جو یہ سنا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر مارے اور کہا: افسوس افسوس! میں نے اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اب ان حالات میں کیا اپنے سر پر خاک ڈالوں مجھے حقیقتاً معلوم نہیں کہ کیا کروں۔ ہمارے پاس یہاں نہ ساز و سامان ہے، نہ ہمیں یہاں کوئی جانتا ہے، نہ یہاں کوئی حکیم ہے اور نہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا۔

چاندنی میں عورت کی نگاہ ایک کھنڈر پر پڑی جو وہاں قریب ہی میں تھا۔ اس نے کھنڈر کی طرف اشارہ کیا اور کہا: وہاں چلتے ہیں، شاید وہاں بچے کو جنم دے سکوں۔

دونوں کھنڈر میں چلے گئے، بیچارے کمال الدین کو ایک پھٹی پرانی چٹائی مل گئی۔ اس نے کھنڈر کے ایک گوشے کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا وہاں چٹائی بچھائی اور کہا: اچھا اب بتاؤ اور کیا کروں؟

عورت نے اپنے ساز و سامان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میری بغچی میں سے مٹی کا ایک پیالا نکالو اور اس میں گھی اور شہد ڈالو اور لے آؤ۔

کمال الدین کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی بیوی کی ان باتوں پر ہنسے یا روئے، اس نے کہا: عقلمند عورت! آخر تجھے معلوم بھی ہے کہ تو کہاں ہے؟ تو سوچ رہی ہے کہ اپنے ہی گھر میں ہے کہ اس طرح مجھے حکم دے رہی ہے۔ گھی کہاں ہے، کس سے لوں، کہاں سے لاؤں۔

عورت نے کہا: تو پیالہ اٹھا، باہر نکل، باقی خدا پر چھوڑ دے۔

کمال الدین سوچ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیا خواب میں دیکھ رہا ہے۔ وہ شہر کے کوچوں اور گلیوں میں گھی اور شہد کی تلاش میں گھومتا رہا۔

وہ کچھ دیر چلتا رہا۔ اس کی نگاہ ایک بقال کی دوکان پر پڑی جس کے دروازے بند تھے، لیکن دوکان کے رنگ و روغن اور ظاہر سے وہ سمجھ گیا کہ یہ بقال کی دوکان ہے۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہاتھ سے دروازے کو پیٹا۔ وہ حقیقتاً اپنے حال واحوال کو سمجھ نہ سکا۔

ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا اور پوچھا: کیا بات ہوگئی؟ میرے گھر کا دروازہ اس طرح پیٹ رہا ہے جیسے طاعون آ گیا ہو۔

کمال الدین نے اسے مٹی کا پیالہ دکھایا اور کہا: خدا تمہارا بھلا کرے اس پیالے میں میرے لیے کچھ گھی اور شہد ڈال دو۔

بوڑھے نے کہا: تو مجنوں ہے یا بے کار ہے؟ آخر اس رات کے وقت، کیا انسان گھی اور شہد کھانے کی ہوس کرتا ہے؟ کمال الدین اب اپنے آپ کو روک نہ سکا، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے کھنڈر کی طرف اشارہ کیا اور کہا: یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں نہ مجنون ہوں اور نہ بے کار، اس کھنڈر میں ایک بیمار ہے جو گھی اور شہد کا منتظر ہے۔ جلدی کرو اگر دیر میں پہنچا، ممکن ہے وہ ہاتھ سے چلا جائے۔

بوڑھا بنیا تیل کا چراغ لایا۔ اس نے دوکان کا دروازہ کھولا اور ایک مٹکے سے شہد اور ایک مشک سے گھی نکالا اور مٹی کے پیالے میں ڈال دیا اور کہا: پانچ دینار ہوئے۔

کمال الدین نے اپنے کپڑے جھاڑ کر دیکھ لیے۔ اسے پتا چلا کہ اس کے پاس پانچ دینار سے زیادہ نہیں ہیں۔

اس نے وہ جلدی سے بنیے کو دیے۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ کھنڈر کی طرف دوڑا جہاں اس نے اپنی بیوی کو ایک چٹائی پر سلا دیا تھا۔

وہ جا رہا تھا اور بیوی تک پہنچنے میں زیادہ فاصلہ نہیں بچا تھا کہ تاریکی میں اتفاق سے اس کا پیر ایک پتھر سے ٹکرایا وہ گر پڑا اور مٹی کا پیالہ، شہد اور گھی اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ پیالہ دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹکڑے ہو گیا اور گھی اور شہد زمین پر گر پڑے۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، بیچارے کمال الدین کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی اس نے اپنے سر پر زور سے دونوں ہاتھ مارے، اور اس حال میں کہ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ رونے اور دوڑنے لگا۔

محلے کے لوگ اس شور وغل کی وجہ سے بیدار ہو گئے تھے۔ وہ ہیجان اور سراسیمگی کے عالم میں اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تا کہ پتا چلائیں کہ ماجرا کیا ہے۔

اس وجہ سے سب نے کمال الدین کو گھیر لیا اور اس سے پوچھ تاچھ شروع کر دی۔

بالآخر ایک شخص جو پرسکون تھا، آگے آیا۔ دوسروں کو ایک طرف کنارے کیا اور کہا: اس طرح جو تم نے اس بندۂ خدا کو گھیر رکھا ہے، کوئی بھی ہو، وہ ڈر جائے

گا، وحشت زدہ ہوجائے گا۔ چلو دیکھیں اصل قصہ کیا ہے اور یہ کس مشکل میں گرفتار ہے۔

کمال الدین نے کہا: میرے پاس پانچ دینار تھے۔ میں نے گھی اور شہد خرید لیا۔ جیسے ہی میں نے ٹھوکر کھائی، مٹی کا پیالہ گر کر ٹوٹ گیا اور گھی اور شہد بھی مٹی میں مل گئے۔

اجنبی شخص نے کہا: آخر کون عقل مند شخص پانچ دینار کے گھی اور شہد کے لیے اس آدھی رات کو سارے شہر کو اپنے سر پر اٹھائے گا۔

کمال الدین کے حواس اب آہستہ آہستہ بجا ہو رہے تھے۔ اس نے جواب دیا: یہ سب کچھ پانچ دینار کے لیے نہیں ہے۔ میں کچھ مدت پہلے حج کے سفر سے لوٹ رہا تھا، میری کل پونجی ایک موتی تھا۔ وہ گم ہوگیا، اس وقت بھی میں اس قدر دکھی نہیں ہوا۔ لیکن اس وقت اس لیے پریشان ہوں کہ میری بیوی اس کھنڈر کے ایک کونے میں بچہ جننے کے عالم میں ہے اور میں یہ شہد اور گھی اس کے لیے نہیں لے جا سکا۔

اجنبی شخص نے اس کی باتیں یہاں تک سنیں، اپنے ہاتھ سے کمال الدین کا کندھا تھپتھپایا اور کہا: ارے، پہلے کیوں نہیں کہا؟ ہم تو سمجھے تھے کہ تو ایک فراری اور دیوانہ ہے۔

اس گفتگو کے بعد، اس اجنبی شخص کے گھر سے چند عورتیں باہر نکلیں اور تیزی سے کھنڈر میں گئیں۔ انہوں نے کمال الدین کی بیوی کو گود میں اٹھایا اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے، اسے اپنے گھر میں لے آئیں۔

بالآخر ایک گھنٹے بعد کمال الدین کی بیوی نے خوشی اور سلامتی کے ساتھ بچے کو جنم دیا اور وہ ایک لڑکی کے ماں باپ بن گئے۔ اور لمبے عرصے تک پریشانیاں

اور سختیاں برداشت کرنے کے بعد انہوں نے آرام وسکون کا سانس لیا۔

اس وقت کمال الدین نے اپنے خدا کا شکریہ ادا کیا اور بستر پر لیٹ گیا تا کہ کچھ دیر آرام کر سکے۔ حالاں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کل کیا اتفاق رونما ہونے والا ہے، اور اس شخص نے اسے کس غرض سے پناہ دی ہے۔

اس سخت رات کی بہر طور صبح ہوگئی۔ کمال الدین نے نماز پڑھی اور اس لیے کہ خداوند تعالیٰ نے بہر صورت اس کی بیوی اور بچے کو موت سے محفوظ رکھا تھا، وہ سجدۂ شکر بجالایا۔

آخر کار ناشتہ کرنے کے بعد، وہ اجنبی شخص کمال الدین کے پاس آیا اور ایک تھیلی اس کے سامنے رکھ دی اور کہا: اس تھیلی میں تین سو دینار ہیں۔ شہر جاؤ، اس سرمایہ کو کسی کام میں لگاؤ۔ اور جب تک تمہاری بیوی کی حالت بہتر نہیں ہو جاتی، میرے گھر میں رہو۔ اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، کیا پیش آتا ہے۔

کمال الدین کو تعجب ہوا اور اس نے پوچھا: بندۂ خدا! تو حقیقتاً مجھے جانتا نہیں، بتاؤ آخر کس اعتبار پر یہ رقم میرے سپرد کی ہے؟

اس نئے دوست نے کہا: پریشان مت ہو، یہ تمہارا حق ہے۔ میرا یقیناً یہ مقصد نہیں کہ تمہیں صدقہ دوں۔ جلدی ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گا اور پھر لازمی طور پر دکھی بھی نہیں ہوگے کہ میں نے یہ کام کس وجہ سے کیا ہے..... بس کھڑے ہو جاؤ، کمر ہمت باندھو اور خدا کی مدد سے حلال روزی کی تلاش میں نکل جاؤ۔

کمال الدین حالاں کہ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہا ہے یا بیداری میں، اس نے اس شخص سے تین سو دینار لیے اور کسی کام کاج کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

وہ چلا گیا۔ دو تین دن کام کیا۔ اس رقم سے اس نے ایک چیز خریدی، اسے

فروخت کیا، اپنی ضرورت کے لیے کسی کے آگے دست نیاز پھیلائے بغیر، اس کا کاروبار چل نکلا۔

تین دن بعد، کمال الدین کی بیوی نے اکیلے میں اس سے گفتگو کی اور کہا: میاں! اب ہمیں یہاں سے چلنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ خیریت سے گذر گیا۔ ہمارا بچہ بھی ٹھیک ٹھاک پیدا ہوا ہے۔ بس اب کوئی اور کام نہیں ہے، ہاں اس کے سوا کوئی اور کام نہیں کہ سفر کا انتظام کریں اور چند دن میں یہاں سے چلے جائیں..... آخر ہم ابد تک اس شخص کے گھر میں نہیں رہ سکتے۔

کمال الدین نے کچھ سوچا اور کہا: آج رات جیسے ہی کھانا کھا چکیں گے، رات کی بیٹھک کے لیے صاحب خانہ کے کمرے میں جائیں گے۔ میں تمام باتیں اس سے کہہ دوں گا اور طے کرلیں کہ تین سو دینار اسے ہم کیسے لوٹائیں۔

مختصر یہ کہ اس رات کمال الدین اور اس کی بیوی، رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے میزبان کے کمرے میں گئے۔ ہر نوعیت کی باتیں کہیں اور سنیں پھر بات یہاں تک پہنچی کہ کمال الدین نے اپنا موتی کھودیا اور وہ اس طرح اس پریشان حالی اور مشکل میں گرفتار ہوگیا۔

اس موقع پر میزبان اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور طاق میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی اٹھائی اور اسے کمال الدین کے سامنے رکھ دیا اور کہا: اے بندۂ خدا! کیا وہ تھیلی جو تو نے اس دریا کے نزدیک چھوڑ دی تھی، یہ تھی؟

کمال الدین نے جیسے ہی وہ تھیلی دیکھی، اس کا منھ کھولا، اس کے اندر جھانکا تو تعجب و ہیجان سے اس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس کے بعد اس نے میزبان کی طرف رخ کیا اور کہا: میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں؟ میرا موتی یہاں کیا کر رہا ہے؟ مجھے تو بالکل یقین نہیں

آ رہا ہے۔

میزبان مسکرایا اور کہا: صحیح، زمانے کا یہی دستور ہے۔ بعض اوقات کسی جگہ کوئی ایسی چیز انسان کے ہاتھ لگ جاتی ہے کہ اس کی توقع بھی نہیں ہوتی۔ اچھا اب یہ نہیں پوچھو گے کہ یہ موتی میرے ہاتھ کیسے لگا اور تو نے اسے دوبارہ کیسے دیکھا؟

کمال الدین خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اس نے کہا: اب یہ سب پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی مجھے پورا قصہ سناؤ۔ کمال الدین کے میزبان نے کہا: سچ پوچھو تو قصہ یہ ہے کہ میں ایک کارواں کے ساتھ تجارت کے لیے جا رہا تھا۔ میرے پاس تجارت کا بہت سا ساز و سامان بھی تھا۔ راستے میں اچانک ریت کے طوفان میں پھنس گئے۔ کارواں اور کارواں والوں نے ایک دوسرے کو گم کر دیا اور شاید کچھ لوگ مٹی کے بڑے بڑے تودوں کے نیچے زندہ دفن بھی ہو گئے۔ میں نے جب آنکھیں کھولیں، تو میں نے دیکھا کہ زانو تک مٹی میں دھنس چکا ہوں۔ ایک لق و دق بیابان میں پھنسا ہوا ہوں جس کا نہ آغاز ہے اور نہ انتہا۔ بہر حال اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سفر کے لیے آمادہ ہو جاؤں اور چل پڑوں۔ اس طرح ممکن ہے نجات کی کوئی راہ پیدا ہو سکے۔ مجھے یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ نجات ملے گی بھی یا نہیں اسی طرح ناامید اور افسردہ دل آپ ہی آپ رو رہا تھا اور چلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً دور ایک کارواں نظر آیا..... کارواں کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ ایک مدت بعد کہ میرے ہاتھ پیروں میں جان باقی نہیں رہی تھی، مجھے احساس ہوا کہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ کارواں والوں نے مجھے دیکھا اور ہر شخص نے کچھ نہ کچھ کہا۔ میرے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔ لیکن کاروان سالار نے مجھے پھٹے حال اور برے احوال جو دیکھا تو کہا: تو خود بتا کہ میں کس طرح اس آدمی کو جو دن و رات کی غذا کا محتاج ہے اور

اس کے ہاتھ بھی ہر چیز سے خالی ہیں، اپنے ساتھ لے چلوں؟ اگر تو میری جگہ ہوتا، کیا یہ کام کرتا؟

میں نے کاروان سالار سے التماس کی۔ اس کے پیروں پر گر گیا، لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ آخر کار میں نے مسئلہ کا یہ حل دیکھا کہ اس کے باوجود خود ہی اپنی راہ لوں۔

اسی خاطر میں ریگستان میں گیا اور آبادی میں پہنچا۔ آبادی اور دریا کو دیکھ کر قدرے امید بندھی۔ میں جانتا تھا کہ پانی لینے اور آرام کرنے کی غرض سے کارواں یہاں آتے ہوں گے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسی جگہ صبر سے بیٹھا رہوں تا کہ کوئی آدمی اور آدمی زاد نظر آجائے۔ خوشی خوشی پانی کے کنارے پر گیا۔ وہاں ایک تھیلی نظر آئی۔ تھیلی کو کھولا۔ اس میں ایک موتی نظر آیا۔ موتی کو دیکھ کر میں وہاں رکا نہیں۔ جلدی سے پانی پیا کچھ دیر آرام کیا اور پھر اس ریگستان میں آبادی سے دور چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہاں چور اچکے آ پہنچیں تو ممکن ہے میرے پاس موتی دیکھ کر میرا کام تمام کر دیں..... مختصر یہ ہے کہ تجھے زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس کاروان کے پیچھے چل پڑوں۔ وہی کارواں جس کے کاروان سالار نے میری تہی دستی دیکھ کر مجھے کارواں سے باہر کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں قریب ہی مجھے وہی کارواں نظر آ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل سے مجھے نجات مل گئی ہوگی مجھے تردد تھا کہ قافلہ سالار سے کہوں یا نہیں کہ اب میرے پاس ایک موتی ہے۔ آخر مجھے خوف تھا کہ ممکن ہے اس کارواں میں کہیں ایسے لوگ نہ ہوں کہ موتی کے مالک بن جانے کے لالچ میں میرا خون بہا دیں۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ خود کاروان سالار میرے نزدیک آیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے میرا

استقبال کیا اور کہا: تیرے کارواں سے دور ہوجانے اور چلے جانے کی وجہ سے ہمارے چند اونٹ بھاگ گئے اور کسی انجانی طرف نکل گئے۔ مجھے خیال آیا کہ ہم نے تجھے کارواں سے دور کردیا ہے اور تیرا دل ٹوٹنے کی وجہ سے یہ اتفاق رونما ہوا ہے۔اسی خاطر میں تیرے پیچھے چل پڑا تا کہ تو ہمارا ہم سفر ہوجائے اور کوئی دوسرا ناگوار اتفاق رونما نہ ہو۔

قافلہ سالار کی ان باتوں کے بعد، میں ان کے ساتھ ہولیا اور ہفتوں کی پریشانیوں، زحمت اور محنت کے بعد اپنے شہر اور ملک پہنچا۔ میری ایسی حالت تھی کہ میرے پاس ایک ہبّہ بھی نہیں تھا۔ میں جن لوگوں کا قرض دار تھا، وہ سب سے پہلے لوگ تھے جو میرے استقبال اور خوش آمد کہنے میرے گھر آئے، لیکن جب انہوں نے سنا کہ ایک طوفان میں پھنس گیا تھا، ان میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کہا اور میرے گھر اور آنگن سے باہر چلے گئے..... ان لوگوں میں صرف میرے ایک دوست نے میری باتوں پر یقین کیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟

اس موتی کو دیکھ کر جو میرے ہاتھ لگ گیا تھا، میں نے اس سے کہا اگر میں ناجائز کام کرنے والوں میں ہوتا تو آسانی سے یہ قیمتی پتھر فروخت کردیتا اور اس طرح اپنے آپ کو خاص وعام میں انگشت نما نہ کرتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک ضروری ہوگا، میں صبر کروں گا، پوچھ گچھ کروں گا، تحقیق کروں گا تا کہ اس موتی کا اصل مالک مجھے مل جائے..... میرے دوست نے میرے اسی طور طریق کی وجہ سے مجھے کچھ رقم دی تا کہ قرض خواہوں کو ادا کردوں اور اپنی زندگی کو راستہ پر ڈال دوں..... یہی بات ہے کہ میں آج تک تیرا منتظر تھا۔

کمال الدین نے کہا: بندۂ خدا! یہ عجیب حکایت ہے، لیکن تو نے اسی رات مجھ سے کیوں نہیں کہا کہ تو نے اس شخص کو تلاش کرلیا ہے جس کا موتی کھوگیا تھا؟

میزبان نے کہا: بندۂ خدا! کیا عقل اس طرح کے کام کی اجازت دیتی ؟وہ تمام پریشانیاں اور مصیبتیں جو تیرے سر پر آپڑی تھیں، اگر اچانک تجھے اس کی خبر ہوجاتی کہ موتی میرے پاس موجود ہے، تو ممکن ہے تو خوشی سے مر جاتا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ یہ خبر آہستہ آہستہ تجھے دوں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تو ہی ہے جسے خدا نے میری پریشانی سے نجات کا وسیلہ بنایا ہے۔ چوں کہ اگر وہ کاروان سالار مجھے اپنے سے دور نہ بھگا دیتا تو شاید میرے پیر ریگستان کی اس آبادی تک نہ پہنچتے اور تو اب موتی کا مالک نہ بنتا۔ اگر یہ موتی میرے ہاتھ نہ لگتا، کیسے ممکن تھا کہ اپنی بات کی صداقت کو ثابت کرسکتا، حالاں کہ میں فریبی اور دھوکے باز نہیں۔ حق یہ ہے کہ خدا سے بہتر کوئی مددگار نہیں۔

☆☆☆

سنہرا پیالہ

برسوں پہلے کی بات ہے، قدیم زمانے میں ایک جوان شخص اپنے شہر اور ملک سے لمبے عرصے تک دور رہنے کے بعد اپنے وطن کے سفر پر نکلا۔

کس لیے؟ ملاقات کرنے اپنے بوڑھے ماں باپ، دوستوں، آشناؤں اور رشتے داروں سے۔ اس جوان نے بہت دن سفر کیا یہاں تک کہ اسے نزلہ زکام ہوگیا، وجہ یہ تھی کہ جوان سردی کے موسم میں سفر کر رہا تھا۔

ایک بار جیسے ہی اس کے ہوش وحواس ٹھکانے آئے، اس نے اپنے سے کہا: ارے غافل انسان! نزلہ زکام تو زمین وآسمان سے برس رہا ہے، اور تو اس بیابان میں پھنسا ہوا ہے۔

اسی ادھیڑبن میں تھا کہ برف بھی پڑنے لگی اور اب ایک موٹی سفید چادر ہمارے مسافر کی آنکھوں کے سامنے یہاں سے وہاں تک بچھی ہوئی تھی۔

جوان نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنے دل میں کہا: بہر حال کوئی اور چارہ نہیں! جس طرح بھی ہوسکے مجھے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ اگر میں نے چلنے میں دیر کی تو پھر کہیں بھی نہیں پہنچ پاؤں گا اور یہیں راستے میں سردی سے جم جاؤں گا۔

جوان نے اسی نزلے زکام کی حالت میں اپنا سفر جاری رکھا، اب کچھ نہیں بچا تھا کہ اس کو سفر سے باز رکھے، اس بندۂ خدا نے جیسے ہی اپنا سفر دوبارہ شروع کیا، اچانک اس بیابان میں ایک نور دیکھا جو روشن تھا۔

نور کو دیکھ کر، مسافر نے سمجھا کہ لو رات بھی آ پہنچی ہے اور دنیا کو روشن کرنے والا سورج مغرب کے کوئیں میں جا چکا ہے۔

حالاں کہ اس نور کو دیکھ کر اس میں نئی جان آ گئی تھی، وہ اسی انجان نور کی طرف بڑھا۔ چند قدم ہی چلا ہوگا کہ اس نے اچانک اپنے سامنے پانی کی ایک چکی دیکھی۔ تھکے ہارے مسافر کے لیے اس سنسان بیابان میں پن چکی کی عمارت، جنت کے ایک محل سے کم نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پن چکی کی عمارت میں جو بھی تھا، اس سے دروازہ کھولنے کی درخواست کی۔ ابھی اس صورت حال کو کچھ بھی وقت نہیں گزرا تھا کہ دروازہ کھلا اور اس کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی: آ نوجوان اندر آ جا، جلدی کر موسم بہت ٹھنڈا ہے۔

جوان مسافر نے فوراً ہی حرکت کی اور پن چکی کی عمارت میں جلدی سے داخل ہوگیا۔ وہ کچھ دیر بے ہوش پڑا رہا، پھر اچانک ہی وہ ایک دلچسپ حرارت کی وجہ سے بیدار ہوگیا۔ ہاں..... پن چکی والے نے اس کے لیے آگ جلادی تھی تا کہ وہ ہوش میں آ سکے۔ جب یہ جوان ہوش میں آ گیا تو پن چکی والے نے اس سے پوچھا: ارے جوان! آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ تو نے اس جما دینے والی سردی میں سفر کرنا شروع کر دیا؟ تو نے اتنی آسانی سے اپنا آرام و قرار ترک کر دیا؟

جوان نے کہا: برسوں ہو گئے تھے کہ میں اس طرف آیا نہیں تھا، سردی جلدی شروع ہوگئی، صحیح بات یہ ہے کہ چند سال سے میں اپنے ماں باپ سے نہیں مل سکا ہوں۔ میرا ارادہ ہے ان سے مل لوں، ان کو دیکھ لوں، جب ان سے مل لوں گا،

انہیں کچھ رقم بھی دیدوں گا اور پھر سے اپنے کام کاج کی طرف لوٹ آؤں گا۔

پن چکی کے مالک نے اس کی باتیں سنیں، سر ہلایا اور کہا: اچھا، تیری یہ زحمت قابل تعریف ہے، خاص طور پر اس لیے کہ تو اپنے والدین کی مدد کرنا اور ان کی دستگیری کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ سمجھ لے کہ اس پن چکی سے شہر تک زیادہ فاصلہ نہیں ہے، اگر تو یہ رات سلامتی سے یہاں گذارے گا اور کل موسم بھی لازمی طور پر ٹھیک ہوجائے گا، تو اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔

جوان نے جب پن چکی والے سے یہ باتیں سنیں تو اس کے حق میں دعا کی اور کہا: مجھے امید ہے کہ کبھی تیری اس محبت کا میں بدلہ چکاؤں گا۔ اگر میں اس پن چکی تک نہ پہنچ پاتا، پتا نہیں دو تین دن تک کس بلا میں مبتلا رہتا۔

پن چکی والے نے سر ہلایا، وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے تو کوئی خاص کام کیا ہی نہیں کہ جو وہ مسافر اس کی اس قدر زیادہ قدر دانی کر رہا ہے، پھر وہ کھانا تیار کرنے میں مشغول ہوگیا۔

جوان نے نماز پڑھی، کھانا بھی کھایا۔ چوں کہ بہت تھک گیا تھا، ایک کونے میں لیٹ گیا اور پھر جلدی ہی سوگیا۔

اگلے روز صبح وہ خوش وخرم نیند سے جاگا، اٹھا، دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا۔ موسم صاف تھا۔ اب برف باری نہیں ہورہی تھی۔ جوان نے صبح کی نماز پڑھی۔ چند روٹیاں کھائیں سفر کا نیا مختصر سا سامان اکٹھا کیا، اٹھایا اور چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ چلنے سے پہلے، وہ پن چکی والے کی عنایت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی انٹی پر ہاتھ رکھا کہ چند سکے اس کو دے دے، لیکن جیسے اس کے سر پر پہاڑ ٹوٹ گیا ہو، ہاں، اس کے پاس جو ایک ہزار سکے تھے۔ ان کا پتا نہیں تھا، وہ پریشانی کے عالم میں پن چکی کی عمارت میں اپنی رقم کو ڈھونڈنے لگا۔ پن چکی والے

نے پوچھا: جوان کیا ہوا؟ تو کیا ڈھونڈ رہا ہے؟ مجھے بتا کہ تیری مدد کرسکوں۔

جوان نے کہا: رقم کی میری تھیلی نہیں مل رہی، جیسے پانی ہوگئی اور مٹی میں جذب ہوگئی ہو۔ پن چکی والے نے کہا: تو نے شاید راستے میں اسے گم کردیا ہے، آخر تو نے ایک لمبا راستہ پا پیادہ تو طے کیا ہے۔

جوان نے کہا: جب میں نے اس پن چکی کی عمارت میں پیر رکھا تھا، میری رقم میرے پاس تھی، میں نے اپنی انٹی کو ہاتھ سے دیکھا بھی تھا اور رقم کی تھیلی کے صحیح سالم ہونے پر مجھے خوشی بھی ہوئی تھی، لیکن نہیں معلوم، اس کے بعد رقم کی میری تھیلی پر کیا بلا نازل ہوگئی۔

پن چکی والا جوان کی یہ باتیں سن کر، کچھ ناراض ہوا۔ اس نے پوچھا، یعنی تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ رقم کی تیری تھیلی میں نے اٹھالی ہے؟

جوان نے کہا: میں نے یہ کب کہا؟ میں نے تو یہ کہا ہے کہ رقم میرے پاس تھی۔ جب میں اس عمارت میں داخل ہوا، تھکا ہارا تھا۔ حواس باختہ، ممکن ہے میں نے رقم کی تھیلی کہیں رکھ دی ہو۔ اگر میں یہاں اِدھر اُدھر اس کی تلاش کروں تو شاید مجھے وہ تھیلی کہیں مل جائے۔

جب پن چکی کے مالک نے اس جوان سے یہ سب سنا تو اس کا گریبان پکڑلیا اور کہا: اے گستاخ نمک حرام! تو نے اپنی باتوں سے ثابت کردیا کہ تو اس محبت کے رویے کو جو میں نے تیرے ساتھ روا رکھا، اہمیت نہیں دیتا، اس کا قائل نہیں۔ اب جلدی کر، یہاں سے باہر نکل، اس سے زیادہ تیرا منہ دیکھنے کا میں روادار نہیں۔

جلدی کر یہاں سے دفع ہوجا، اگر تو میری دم پر پیر رکھے گا تو پھر تیری خیر نہیں۔

جوان نے کہا: لیکن میں چاہتا ہوں کہ تیرے سامنے شرمندگی سے نجات

پا جاؤں۔

پن چکی والا چیخا: میں نے اپنی مزدوری وصول کر لی، اب یہاں سے جلدی رفو چکر ہو جا۔

جوان مسافر پن چکی کے مالک کے اس رویے سے بہت زیادہ گھبرا گیا تھا۔ وہ باہر آ گیا اور شکستہ دل اور پریشان، اجنبی شہر کی طرف چل دیا۔

ہمارے قصے کے مسافر نے شہر تک پہنچنے کے راستے میں بہت غور و فکر کیا، وہ بالآخر سمجھ گیا کہ پن چکی والے کی وہ سب ڈرامہ بازی بڑی سوچی سمجھی تھی۔ وہ اپنے اس پلان سے میرے پاس جو کچھ بھی تھا، اس کا مالک بن گیا اس وجہ سے اس نے فیصلہ کیا کہ شہر قاضی کے پاس جائے اور اس پن چکی والے کی شکایت درج کرائے، پھر اس کے بعد قاضی کے دفتر گیا اور قاضی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

قاضی نے جوان کی باتوں کو بہت غور سے سنا اور پھر پوچھا: اچھا بتا کیا تیرا کوئی شاہد و گواہ بھی ہے کہ تو رقم کی ایک تھیلی کے ساتھ پن چکی میں داخل ہوا تھا۔

جوان نے جواب دیا: قاضی صاحب گواہ کیسا؟ میں تو اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔

قاضی نے کہا: میں صرف تیرے کہنے پر کس طرح اس شخص پر چوری کا الزام لگا سکتا ہوں؟ اس لیے بہتر ہے، صبر کر اور اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل وشواہد ڈھونڈنے کی کوشش کر۔

اس طرح قاضی کے محکمے میں بھی جوان کے راستے میں روڑے اٹک گئے۔ وہ اس وجہ سے وہاں سے باہر آ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس اجنبی شہر میں اب

کیا کرے، کہاں جائے۔

اب آیئے وہیں پن چکی پر چلتے ہیں۔

جوان کے چلے جانے کے بعد، پن چکی والے نے اس بندۂ خدا کی تھیلی کھولی۔ان درہم و دیناروں کو دیکھنے لگا جو تھیلی میں تھے۔وہ یہ رقم پا کر اس قدر خوش تھا کہ اس نے رات تک اس سونے چاندی کو کئی مرتبہ گنا اور اسے خرچ کرنے کا پلان بنایا۔

خلاصہ یہ کہ خدا کا وہ دن بھی گذر گیا۔ رات ہوگئی، زمین و زمان پر بھی سکوت و خاموشی چھاگئی۔ ابھی رات زیادہ نہیں گذری تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پن چکی والا یہ آواز سن کر اپنی جگہ سے اچھلا۔ایک طرف گیا ایک خنجر اٹھایا اور دروازہ کی طرف چلا گیا۔وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اجنبی جوان اپنی رقم وصول کرنے اس کے پاس آیا ہے۔اس لیے اس نے خنجر کو اپنی کمر کے پیچھے چھپالیا۔ آہستہ سے دروازہ پر گیا۔باہر برف باری ہورہی تھی اور تیز ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔

پن چکی والے نے بادل ناخواستہ لکڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے دیکھا کہ چوکھٹ پر ایک شخص کھڑا ہے، بال الجھے ہوئے، چہرے کا رنگ اڑا ہوا، برف اس کے سر اور چہرے پر پڑی ہوئی تھی۔

وہ شخص پن چکی والے سے تعارف کا انتظار کیے بغیر اندر آ گیا اور اپنے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کردیا۔ پن چکی والے کو اس اجنبی شخص کے اس برتاؤ اور حرکت پر تعجب ہوا تھا۔اس نے پوچھا، کیا ہوا بھائی؟ کون ہے تو اور یہاں کیا کررہا ہے؟ اس طرح اندر آ گیا ہے کہ مجھے خیال ہوا جیسے تو بھیڑیے سے بچ کر بھاگا ہے۔

اجنبی شخص نے کندھے پر رکھے اپنے تھیلے کو زمین پر رکھا اور کہا: کیا کوئی

بھیڑیا اس شدید سردی سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔ اجنبیت ہی کا غم کیا کم تھا کہ اس شدید سردی میں پھنس گیا۔ میں آج رات تیرا مہمان ہوں کل اگر چاہا تو چلا جاؤں گا اور اس شرمندگی سے آزاد ہو جاؤں گا۔

پن چکی والا یہ باتیں سن کر مسکرایا اور بولا: ایک رات کیا ہوتی ہے، اگر تو چاہے تو یہاں ایک سال رہ سکتا ہے۔

وہ پریشان حال شخص بولا: کیا اس وقت کچھ ہے کہ کھالوں۔ بھوک سے میری جان نکلی جارہی ہے۔ پن چکی والے نے اس پریشان شخص کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ وہ بھی بڑی رغبت اور شوق سے کھانا کھانے لگا، جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے پن چکی والے کی طرف دیکھا اور کہا: کہیں کچھ بچھادے، میں سو جاؤں۔

پن چکی والے نے مہربانی سے اس اجنبی کے لیے نرم وگرم بستر بچھادیا۔ وہ جب دسترخوان پر سے اٹھا تو اس نے خود کو بستر پر گرادیا۔ جلدی ہی اس کے خراٹوں کی آواز کو نجنے لگی۔ وہ اس طرح بے خبر سو رہا تھا جیسے سو سال سے نہ سویا ہو۔ جب وہ اجنبی سو گیا تو پن چکی والا دبے پاؤں اس کے تھیلے کی طرف بڑھا جو ایک کنارے پڑا ہوا تھا۔ اس نے تھیلے کو چھوا جو کچھ اس میں تھا، ان چیزوں سے اسے خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا۔

اس نے کچھ دیر سوچا اور تشویش میں پڑ گیا۔ پھر بالآخر تھیلے کو زمین پر سے اٹھایا اور یہ خیال رکھا کہ اجنبی نیند سے بیدار نہ ہو جائے، اس نے تھیلے کا منہ کھولا۔

صبح ہوگئی۔ اجنبی شخص کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اس کے بال اور چہرہ درہم برہم تھا۔ اس نے اسی عالم میں پن چکی والے کو دیکھا اور کہا: اب مجھے چلنا

چاہیے چوں کہ بہت کام ہیں۔ بہت جلدی ہی مجھے نکل جانا چاہیے۔

پن چکی کا مالک بولا: آخر ایسی کیا جلدی ہے؟ دو تین دن ہمارے پاس رہو۔ میرا وعدہ ہے تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

پن چکی کا مالک بولا: میں نے کسی روپے پیسے کے لیے دروازہ نہیں کھولا تھا ورنہ میں کل رات ہی جیسے ہی تو نے پن چکی میں پاؤں رکھے تھے، اجرت طے کرلیتا۔ اب تو جو چاہے مجھے دے دے۔

اجنبی شخص نے اپنی انٹی میں ہاتھ ڈالا اور ایک بٹوا نکالا۔ اس میں سے کچھ سکے نکالے اور پن چکی والے کو دے دیے اور کہا: تو، یہ ایک رات کی تمہاری مہمانداری کی اجرت ہے۔ یہ کہنے کے بعد، اس نے زمین پر سے اپنا تھیلا اٹھایا، وہ جانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے تھیلے کو ادھر اُدھر سے ٹٹولا اور کہا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا تھیلا کچھ ہلکا ہوگیا ہے'' یہ کہا اور تھیلے کا منہ کھولا۔ چند بار تھیلے میں چیزوں کو الٹا پلٹا، پن چکی والے کی طرف دیکھا اور کہا: سونے کا ایک پیالہ اس کے اندر تھا۔ لیکن وہ اب اس میں نہیں ہے۔ تجھے نہیں معلوم وہ کہاں گیا؟

پن چکی والے نے اس معاملہ سے بے خبر ہونا ظاہر کیا اور کہا: مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟ کیا یہ وہی پیالہ ہے جو کل رات تو اپنے ساتھ لایا تھا؟

اجنبی شخص آگے بڑھا اور پن چکی والے پر چیخا اور بولا: جلدی کر، سونے کا پیالہ مجھے دے ورنہ جو کچھ تیرے ساتھ سلوک کروں گا، تو دیکھتا رہ جائے گا۔

پن چکی والے نے اس پریشان حال کا گریبان پکڑلیا اور کہا: جلدی کر، یہاں سے باہر نکل۔ کاش میں نے تیرے لیے دروازہ نہ کھولا ہوتا، تو اسی شدید سردی میں اکڑ گیا ہوتا۔

اجنبی شخص پن چکی والے سے قد و ہیکل اور جثّے میں زیادہ بڑا تھا۔ اس نے

پن چکی والے کو زمین سے اٹھالیا اور کہا: جلدی کر، سونے کا پیالہ مجھے دے ورنہ تجھ پر وہ بلا نازل کروں گا کہ دیکھتا ہی رہ جائیگا۔

پن چکی والا بولا: ارے یہاں سے جلدی نکل، ورنہ تیری شکایت کردوں گا۔ کیا یہ میری محبت ومہربانی کا صلہ ہے؟

اجنبی شخص نے کہا: یہ جان لے میں ایک چور ہوں۔ جو کچھ اس تھیلے میں ہے، وہ چوری کا مال ہے۔کل جو میں اس طرف نکل آیا، اس خاطر سے تھا کہ میں نے حکومت کے کارندوں سے فرار اختیار کیا تھا۔اب تو نے سمجھ لیا کہ میں کون ہوں، جلدی کر سونے کا پیالہ مجھے واپس کر۔

پن چکی والا بولا: اچھا تو چور ہے اور سب کو چوروں کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میرے گھر میں آ گیا، سردی اور بھیڑیوں کے چنگل سے بچ گیا، اور اب مجھ پر چوری کا الزام لگاتا ہے؟

چور نے کہا: میں چور ہوں، لیکن خیانت کار نہیں، میں چور ہوں لیکن تو امانت میں خیانت کرتا ہے۔تو نے خود ایک پن چکی والے کے شکل وصورت اختیار کر لی ہے تا کہ ان بیچاروں کے تھیلے خالی کردے جو راستے میں تھک کر یہاں آ جاتے ہیں۔اب ہم نے جب ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے، اب آ، اور مردانگی کا ثبوت دے اور بتا کہ تو نے سونے کا پیالہ اٹھایا ہے، میں بھی اس پر مواخذہ نہیں کروں گا۔

پن چکی والا مسکرایا اور کہا: تا کہ پھر تو یہ بھی کہے کہ میں نے تیرے تھیلے میں سے اور دوسری چیزیں بھی نکالی ہیں، ایسا ہی ہے نا؟ اس وجہ سے میں بھی پسند نہیں کرتا کہ کہوں کہ سونے کا پیالہ میں نے اٹھایا ہے۔

پریشان حال شخص نے کہا: تو آرام سے رہ، اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ سونے کا پیالہ تو نے نکالا ہے، تو میں درگذر سے کام لوں گا ورنہ پھر میں جانوں اور قاضی۔

پن چکی والے نے کہا: لو دیکھو، کیا وقت آ گیا ہے، ایک چور میری شکایت کرنے جا رہا ہے۔ اگر میری بات پر یقین نہیں تو اس جگہ کی تلاشی لے۔ بالآخر وہ پانی تو ہو نہیں گیا کہ زمین میں جذب ہو گیا ہو۔

چور نے کہا: اچھا ٹھیک ہے اگر تو چاہتا ہے کہ یہی صورت ہو۔ میں تو جانتا ہوں کہ تو نے سونے کا پیالہ اپنے ہاتھ کے نیچے نہیں چھپایا ہے، لیکن ایسا کام کروں گا کہ تو موت کی آرزو کرے گا اور موت بھی تیری مدد کو نہیں آئے گی۔

اس نے یہ باتیں کیں اور اپنا تھیلا کندھے پر رکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ اب پن چکی والا خوشی میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

چور نے شہر کا رخ کیا، جیسے ہی وہاں پہنچا، سیدھا داروغہ کے دفتر گیا۔ وہاں کے مامورین چور کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ یہ کیسے ہوا کہ ایک چور خود چل کر یہاں آ گیا اور خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔

چور کی کارستانیوں کی تفتیش کے لیے، اسے شہر کے قاضی کے محکمے میں لے گئے۔ قاضی جب مسند قضاوت پر بیٹھا، اس نے چور سے خندہ پیشانی سے بات کی اور کہا: خوش آمدید! آخر کیا ہوا کہ اُس طرف سے اِس طرف آ گیا اور اب چاہتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرے؟

چور نے کہا: میں اس وقت اچھا آدمی نہیں ہوں، لیکن میری آرزو ہے کہ آئندہ نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کروں۔ اس وقت جو چیز اس کا سبب بنی ہے کہ میں حاضر ہوں اور اپنا تعارف کراؤں، وہ ایک ناپاک انسان ہے جو ایک پن چکی والے کے روپ میں اس شہر میں اجنبی اور آشناؤں کو لوٹتا ہے۔

قاضی کو اس پر تعجب ہوا اور اس نے پوچھا: کون سا پن چکی والا؟ تو آخر کس کے بارے میں بات کر رہا ہے، وہ شخص ہے کہاں؟

اس گناہ گار انسان نے جو کچھ اس کے اوپر پن چکی والے کے گھر میں گذرا تھا، قاضی سے کہہ سنایا۔ قاضی نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ جس قدر جلدی ہو سکے، اس جوان کو بلاؤ جس نے پن چکی والے کی شکایت کی تھی۔ اس سے کہو کہ وہ محکمے میں آ جائے۔

یہی ہوا بھی۔ قاضی کے حکم سے پن چکی والا مصیبتوں میں گرفتار ہوا، اس چور کے عقل کا چراغ روشن ہو گیا اور اس جوان کو بھی اس کا حق مل گیا۔

☆☆☆

حاتم اور لکڑہارا

برسوں پہلے قدیم زمانے میں بدوؤں کے بہت سے چھوٹے بڑے قبیلے حجاز کی سرزمین پر اِدھر اُدھر آباد تھے۔ انہی میں سے ایک قبیلے میں حاتم طائی نام کا ایک شخص رہتا تھا۔

حاتم ایک مالدار شخص تھا۔ اور دنیا کی مال و دولت سے اسے بہت زیادہ حصہ ملا تھا۔ وہ اپنی ساری خوشیاں اور غم فقیروں، بیچاروں اور بچھڑے ہوئے لوگوں کی خدمت میں صرف کرتا تھا۔

بالآخر برسوں بعد، حاتم طائی کا نام و نشان اور راہ و رسم کی گونج اس کے اپنے قبیلے یعنی بنی طی کی سرحدوں سے باہر سنائی دینے لگی اور دوسرے قبائل کے لوگوں میں اس کی شہرت ہوگئی۔ اس بناپر کچھ لوگوں میں لالچ نے جوش مارا اور وہ اس کے مال و دولت میں دست درازی پر تل گئے۔

ان میں سے ایک بنی عامر قبیلے کا سردار تھا۔ اس شخص کا نام تھا نوفل بن ہامان نوفل نے اپنے مقصد کی برآری کے لیے کہ وہ حاتم طائی کی مال و دولت کو ہتھیا لے، بنی طی قبیلے پر حملہ کر دیا اور جلد ہی اس پر قابض ہوگیا۔

دوسری طرف دیکھئے، حاتم کو جب یہ احساس ہوا کہ یہ سب فتنہ، شور شرابا

اس کی دولت کی وجہ سے برپا ہوا ہے، وہ بہت خاموشی سے اپنے قبیلے سے باہر چلا گیا تا کہ بغیر کسی قتل و غارتگری کے اس کی دولت نوفل کے تصرف میں آجائے۔ خود یہ فیصلہ حاتم طائی کی جوانمردی اور دوسروں کو معاف کردینے کی خوبی کا ثبوت ہے۔

مختصر یہ کہ نوفل نے بنی طی قبیلے کو اپنا مطیع بنالیا۔ وہ بڑے غرور وتکبر کے ساتھ حاتم طائی کے خیمے میں مسند پر بیٹھا۔ وہ چوں کہ ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں حاتم طائی کی طرف سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچے، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ حاتم کو گرفتار کرلے، اس وجہ سے اس نے اپنے چند لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ہر طرف یہ خبر پہنچادیں کہ جو بھی حاتم طائی کے بارے میں کوئی خبر دے گا، اسے سو دینار انعام دیا جائے گا۔

بہر حال حاتم طائی اپنے قبیلے اور قوم سے دور چلا گیا، بہت دور وہ اس دن اتنا زیادہ چلتا رہا کہ تاریکی پھیل گئی اور سورج مغرب کے کنویں میں ڈوبنے لگا۔ حاتم طائی نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھا تا کہ رات گذار سکے صبح ہوجائے تو پھر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا ہے، اس نے وہیں قریب میں ایک غار دیکھا۔ حاتم اسی غار کے ایک گوشے میں چھپ گیا۔ اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھا اور غور وفکر کرنے لگا۔

اس حالت کو ابھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اس نے غار کے باہر سے ایک آواز سنی۔

اس نے بہت غور سے آواز کو سنا۔ ایک بوڑھا مرد اور عورت آپس میں باتوں میں مصروف تھے۔ بوڑھی عورت نے دریافت کیا: ارے تو آج خالی ہاتھ کیوں لوٹا ہے؟ اب ہم بچوں کو کیا جواب دیں گے؟ وہ بھوکے ہیں۔ بوڑھے شخص

نے جواب دیا: ان سے کہو صبر کریں، تحمل سے کام لیں۔ بہت جلد ہی ہماری حالت بہتر ہونے والی ہے۔ اس طرح یہ ضروری نہیں ہوا کرے گا کہ میں ہر روز زحمت اٹھاؤں، مصیبت میں پڑوں اور لکڑیاں کاٹنے کے چکر میں رہوں۔

بوڑھی عورت نے پوچھا: وہ آخر کب تک صبر کریں؟

بوڑھے نے جواب دیا: بس کل تک یا شاید پرسوں تک .....

بوڑھی عورت بولی: سچ یہ ہے کہ تو نے کچھ بھی تو نہیں سنا! کیا تجھے کوئی خزانہ مل گیا ہے؟ مجھے بتا کہ آج تو تھا کہاں اور تو نے کیا کام کیا؟ بوڑھے نے خوشی اور مسرت سے کہا: جو چیز ممکن ہے میں ڈھونڈ لوں، وہ کسی بھی طرح ایک خزانے سے کم نہیں ہوگی۔ میں آج بھی اس کی تلاش میں گیا تھا، لیکن ڈھونڈ نہیں سکا۔ تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل یا پرسوں، وہ چیز مجھے لازمی طور پر مل جائے گی اور ہم سو دینار کے مالک ہوں گے۔

عورت نے پوچھا: اچھا، وہ چیز ہے کیا، جس کی وجہ سے تو اس قدر زیادہ خوشی سے جھوم رہا ہے؟

بوڑھے شخص نے اسی امید سے کہا: بنی عامر قبیلے کا سردار نوفل بن ہامان کہتا ہے کہ جو شخص بھی حاتم طائی کو ڈھونڈ نکالے گا یا اس کے بارے میں کوئی خبر اس کو دے گا، وہ سو دینار کا انعام حاصل کرے گا۔ اسی وجہ سے بڑی تعداد میں لوگ جنگلوں اور بیابانوں میں سرگرداں ہیں تا کہ حاتم طائی کو ڈھونڈ نکالیں..... جیسا کہ میں نے سنا ہے، کچھ لوگوں نے حاتم طائی کو دیکھا تھا کہ وہ ہمارے قبیلے کے پاس سے گذرا تھا۔ اسی وجہ سے میں حاتم طائی کو ڈھونڈ سکتا ہوں اور نوفل کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔

حاتم طائی غار میں بوڑھے مرد اور عورت کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ان

دونوں کی دور دراز آرزوؤں کا احساس بھی کرلیا تھا کہ وہ اسے پکڑلیں گے اور سو دینار کے مالک بن جائیں گے۔اب وہ فکر میں پڑ گیا اور وہ آرزو کرنے لگا کہ جس قدر ہو سکے جلدی صبح ہو جائے۔

حاتم طائی نے رات تنہائی اور بے کسی میں گذار دی۔ پھر سے صبح ہوئی۔ دنیا کو جگمگا دینے والے سورج نے پھر سے زمان و زمین پر اپنی حکومت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

حاتم طائی نے اکیلے اور تنہائی میں بہت دیر تک اس بوڑھے، بڑھیا اور ان کے بھوکے بچوں کے بارے میں سوچا، ان کے حال احوال کے بارے میں غور کیا کہ وہ کس طرح ان کو درہم و دینار مہیا کرائے تا کہ ان کی زندگی میں کشادہ دستی پیدا ہو سکے۔لیکن اس نے جتنا بھی سوچا اور پلان پر پلان بنائے، اس کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں کہ ان کی مدد کر سکے۔

آخر کار وہ غار سے باہر آ گیا اور خود کو آمادہ اور تیار کرلیا۔اس حال میں وہ اب آرام اور سکون محسوس کر رہا تھا، وہ بوڑھے شخص کے خیمے پر گیا جو غار کے قریب ہی تھا۔ بوڑھا، بڑھیا اور ان کے بچے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حاتم طائی داخل ہوا سلام کیا۔بوڑھے نے اس نووارد کو غور سے دیکھا۔اس کا جائزہ لیا اور کہا: اے اجنبی شخص! اگر تو کھانے پینے کی تلاش میں یہاں آیا ہے تو سمجھ لے اور جان لے کہ ہم خود نان شبینہ کو محتاج ہیں۔

حاتم طائی مسکرایا اور بولا، ارے بوڑھے لکڑہارے تو فکر نہ کر آرام سے رہ، میں کوئی مدد لینے یہاں نہیں آیا ہوں، بلکہ تیری مدد کرنے آیا ہوں۔

بوڑھے لکڑہارے نے حاتم طائی کی باتوں پر تعجب کا اظہار کیا اور بولا: تو

میری مدد کرنا چاہتا ہے؟ تو آخر ہے کون اور کہاں سے آیا ہے؟

حاتم طائی نے اپنا تعارف کرایا اور کہا: میں قبیلۂ بنی طی کا وہی شخص ہوں جس کی تلاش میں تو نے دن گذار دیا اور تجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اب میں آ گیا ہوں تو مجھے نوفل کے پاس لے چل اور سو دینار کا مالک بن جا۔

بوڑھے لکڑہارے نے جب یہ سنا، وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور حاتم طائی کے پیروں پر گر پڑا اور بولا: اے بزرگوار! یہ بڑا پن جس کا تو نے اظہار کیا ہے، اس کے پیش نظر مجھ میں وہ تاب و توانائی نہیں اور میرا وہ منھ نہیں کہ تجھے نوفل بن ہامان کے سپرد کر دوں۔

حاتم طائی نے کہا: اچھا، اب ان سب باتوں کا وقت نہیں۔ میں آخر عمر تک پہاڑوں، بیابانوں اور ریگستانوں میں سرگرداں رہنے اور اس طرح زندگی گذارنے سے تو رہا۔ بالآخر کسی دن لوگ مجھے دیکھ لیں گے۔ پکڑ لیں گے اور نوفل کے سپرد کر دیں گے۔ اس لیے نئے دعویداروں کے پہنچنے سے پہلے کہ وہ مجھے تیرے ہاتھوں سے چھین لے جائیں، مجھے نوفل کے حوالے کر دے۔

بوڑھا اور بوڑھی حاتم طائی کے اس رویے پر کچھ دیر فکر میں پڑ گئے۔ انہوں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آخر کار جب انہوں نے دیکھا کہ خود حاتم طائی اس کام پر اصرار کر رہا ہے اور بضد ہے، انہوں نے آہستہ آہستہ شرم و حیا کو ترک کیا۔ اپنی جگہ سے اٹھے۔ اس کے بعد انہوں نے بچوں کو آرام و سکون کی ہدایت کی اور حاتم طائی کے ساتھ قبیلۂ بنی عامر کی طرف چل دیے۔

راستے میں ان میں سے ہر مسافر کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا:

حاتم طائی یہ سوچ رہا تھا کہ نوفل بن ہامان اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا۔ بوڑھا اور بوڑھی عورت اس فکر میں تھے کہ وہ سو دیناروں کا کیا کریں گے،

انہیں خرچ کیسے کریں گے۔

وہ کچھ دیر چلتے رہے، پھر انہوں نے راستے میں چند لوگوں کو دیکھا۔

وہ آگے بڑھے اور حاتم طائی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور اسی سے اس کا پتا پوچھا۔

حاتم چپ رہا۔ اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن سادہ دل بوڑھا جو حاتم طائی کو اپنے قبضے میں پا کر نہایت خوشی و مسرت میں گرفتار تھا، بولا: اگر تم لوگ حاتم طائی کی تلاش میں ہو، تو پھر زحمت نہ کرو، اس لیے کہ یہ شخص جو ہمارے ہمراہ ہے، وہی حاتم طائی ہے ہم اسے نوفل کے پاس لے جا رہے ہیں۔

جو لوگ راستے میں ملے تھے، انہوں نے جب یہ سنا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ انہوں نے بوڑھے شخص، بوڑھی عورت اور حاتم طائی کو دیکھا۔ ان میں سے ایک نے چمک دار تیز تلوار میان سے باہر نکالی اور بولا: بوڑھے سچ بتا، یہ وہی حاتم طائی ہے؟ یہ کہنے کے بعد، وہ یہ چاہتے تھے کہ بوڑھے اور بڑھیا کا خون بہا دیں۔

حاتم نے جب ان کی زندگی خطرے میں دیکھی تو کہا: ان بے قصوروں کی زندگی بخش دو، میں ہی حاتم طائی ہوں۔ ہم نوفل کے پاس جا رہے ہیں۔ ان کے بس کا کچھ نہیں، یہ تمہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے بلاوجہ ان بے گناہوں کے خون سے کیوں اپنے ہاتھ رنگتے ہو۔

اس طرح حاتم طائی اب اپنے نئے پانے والوں کا قیدی بن گیا۔ انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ قبیلے کی طرف جا رہے تھے کہ برق رفتاری کے ساتھ چند سوار وہاں آ پہنچے۔ وہ گویا یہ جانتے تھے کہ حاتم طائی کون ہے، انہوں نے پلک جھپکتے ہی حاتم اور اس کے ہم سفروں کا محاصرہ کر لیا۔ وہ ہا، ہو کرتے، نعرے

لگاتے ان لوگوں سے برسر پیکار ہوگئے جنہوں نے اس سے پہلے حاتم طائی کو بوڑھے اور بڑھیا کے ہاتھوں سے چھینا تھا۔

جنگ شدید تھی۔ صحرا پر گرد و غبار چھا گیا جو دیکھنے کے قابل تھا۔

بالآخر سواروں کے گروہ نے جو زیادہ طاقتور تھا، پیدل گروہ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ انہوں نے حاتم طائی کو بھی ان کے چنگل سے آزاد کرالیا اور اپنی راہ لی۔

حاتم نے پوچھا: یہ سب جنگ و جدال صرف سو دیناروں کے لیے ہے؟ اگر میں اپنے قبیلے میں ہوتا اور مجھے اپنے مال و دولت کو استعمال کرنے کی قدرت حاصل ہوتی، تو میں تم میں سے ہر ایک کو جو کچھ تم چاہتے، دے دیتا..... اب یہ کیا عقلمندی ہے کہ سو دینار کی خاطر تم لوگ ایک دوسرے پر چمکدار تیز تلواریں سونت لو؟

بیابان گرد ایک سوار نے کہا: ہم صرف سو دینار کی تلاش میں نہیں ہیں ہمارا مقصد یہ ہے کہ تجھے پکڑ کر اور تجھے نوفل کے سپرد کرنے کے بعد، ہم اسے اپنی قدرت و طاقت بھی دکھاسکیں۔ قدرت کے اس مظاہرے کے لیے میان سے شمشیر نکالنا ارزشمندی ہے کہ نہیں؟

حاتم نے کچھ سوچا اور کہا: اگر تم اس طرح اپنی قدرت و طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہو، تو سمجھ لو کہ تم کمزور لوگ ہو۔ طاقت، درگذر کرنے اور جوانمردی میں ہے۔

ایک دوسرا سوار یہ باتیں سن کر غصہ ہوگیا۔ وہ حاتم کی طرف آیا اور کہا: اگر ایک سو دینار کے لیے نہ ہوتا تو ابھی اسی وقت تیرا سر بدن سے جدا کردیتا۔ حاتم مسکرایا اور کہا: ''بس سمجھ لو کہ مجھے پکڑ کر اس طرح تم نہ اپنی قدرت کا مظاہرہ کرسکو گے اور نا ہی دینار تمہارے ہاتھ لگیں گے۔''

سب چپ ہو گئے اور چل پڑے۔اب وہ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن سے گذر رہے تھے۔ کچھ دیر ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔ کسی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن اچانک چپ چاپ کھڑے پہاڑ خود ہی لرز اٹھے اور اونچی آوازوں نے اس جگہ کو بیدار کر دیا۔ان سواروں نے جو انعام حاصل کرنے کی خاطر حاتم کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے، پہاڑوں کے سینوں کو دیکھا۔ انہوں نے پہلے یہ گمان کیا کہ پتھروں کے ٹکڑے نیچے گر رہے ہیں، لیکن جب غور سے دیکھا تو تو پتا چلا کہ کچھ لوگ چیختے فریاد کرتے نیچے آ رہے ہیں۔اب حاتم طائی کے نئے گاہک پیدا ہو گئے تھے۔

جب تک حاتم طائی اپنے قبیلے میں پہنچا، کچھ لوگ زخمی ہو چکے تھے اور کچھ نے ایک دوسرے کے لیے اپنے دلوں میں کینہ کو جگہ دے دی تھی اور ایک دوسرے سے دشمنی پر اترے ہوئے تھے۔ بالآخر سو لوگ جن میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ اس نے باقی دوسروں سے پہلے حاتم کو دیکھا ہے، اس بندۂ خدا کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔اس طرح وہ حاتم طائی کو نوفل بن ہامان کے سامنے لے گئے۔

اگر دوسروں کو معاف کر دینے اور جوانمردی کے محاسن موجود ہوتے تو یہ مشکلیں اور یہ مصیبتیں پیش ہی نہیں آتیں۔

اس وقت..... نوفل دیگر تمام فاتح امیروں کی مانند تکیے سے بالکل اسی جگہ لگا بیٹھا تھا جہاں حاتم طائی بیٹھا کرتا تھا وہی جگہ جہاں حاتم نے اپنی ایک عمر گزاری تھی اور ان محتاجوں کو مدد کی تھی جو اسی لیے اس کے پاس آتے تھے۔

حاتم کے ساتھ کا گروہ ایک وقت تک سکوت وصبر کے ساتھ یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر خود نوفل بن ہامان بولا: اچھا، اب بتاؤ کون ہے وہ جس نے حاتم کو تلاش

کیا ہے تا کہ میں وعدے کے مطابق اس کو انعام واکرام سے نوازوں۔

اس گفتگو کے بعد اس نے آنکھ سے اس تھیلے کی طرف اشارہ کیا جو اس کے ہاتھ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ لالچی مرد اور عورتوں نے جو یہ بات نوفل کی زبان سے سنی تو چیخنے لگے: میں نے ..... میں نے .....

نوفل نے انہیں خاموش رہنے کو کہا اور بولا: بس تو اب حاتم کو گرفتار کرنے کے لیے میں سو دینار نہیں ہزاروں دینار ادا کروں بالآخر اس بھیڑ میں کوئی نہیں جو یہ دعویٰ کرے کہ اس نے حاتم کو سب سے پہلے دیکھا ہے، ہاں ایسا شخص جس نے سب سے پہلے حاتم کو دیکھا ہو۔

یہ سن کر سب کے سب آگے آئے اور کہا: میں نے حاتم کو فلاں جگہ سب سے پہلے دیکھا تھا۔

نوفل نے کہا: ٹھیک ہے اب جب معاملہ یہ ہے، اب میں مجبور ہوں اس مسئلہ کو قرعہ اندازی سے حل کروں، اس طرح ایک شخص کو دس ہزار دینار مل جائیں گے اور مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اگر میں اسی طرح تم لوگوں کے جواب کا منتظر رہا، کئی دن گذر جائیں گے اور معاملہ آگے نہیں بڑھے گا۔ خاص طور پر اس لیے کہ تم میں سے ایک بھی حاضر نہیں کہ دوسروں کی آسودگی کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور درگذر و جوانمردی کا راستہ اختیار کرے۔ حاتم طائی کو ڈھونڈنے والوں نے پھر سے شور وغل مچایا۔ سب ہی نے کچھ نہ کچھ کہا اور قرعہ اندازی کے پھیر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

نوفل بن ہامان اس صورت حال سے بہت زیادہ مضطرب اور غصہ ہوا۔ اس نے اپنے پاس کے لوگوں پر نظر ڈالی اور بولا: تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس معاملہ کا حل مجھے بتائے اور مجھے ان لالچی لوگوں کے چنگل سے نجات دلائے۔

ایک بوڑھا شخص جس کے چہرے سے جہاندیدگی اور بصیرت کے آثار نمایاں تھے، آگے آیا اور کہا: اے نوفل! اگر تو ان لوگوں کی تو تو میں میں، سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور حق کو حقدار تک پہنچانا چاہتا ہے تو سوائے اس کے اور کوئی دوسرا چارہ نہیں کہ اس قصے کو خود حاتم طائی سے پوچھ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، حاتم طائی سچا اور صادق انسان ہے جو کچھ تیرے اور ان لوگوں کے درمیان پیش آیا ہے، اس کے برخلاف نہیں کہے گا۔

نوفل بن ہامان نے جو یہ سنا، اور بھی غصے ہوا اور کہا: یہ کون سا طریقہ ہے جو تو نے بتایا ہے؟ جو شخص میرے سامنے اس قدر زبوں حال اور مشکل میں ہے، وہ کس طرح حوصلہ کرے گا کہ آگے آئے اور بتائے کہ وہ کون شخص ہے جس نے اس کو پہلی بار دیکھا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا خود اس کی تقدیر سے بھی متعلق ہے۔ہاں ہوگا صرف یہ کہ وہ اس طرح خود اپنے زخموں پر نمک چھڑکے گا اور گرفتار کرنے والے کا چہرہ اس کی نگاہوں میں پھر جائے گا۔

اس جہاں دیدہ شخص نے کہا: بہر حال میرا کام تجھے آگاہ کرنا تھا، اب تو خود جان!

نوفل نے ایک لمحہ غور وخوص کے لیے گردن جھکائی، پھر اس نے حاتم طائی کو دیکھا اور کہا: یہ سب فتنہ تیری وجہ سے برپا ہوا ہے، اور یہ آگ تجھے گرفتار کرنے کی وجہ سے لگی ہے، اب تو خود بتا کہ اس بھیڑ میں کس نے تجھے سب سے پہلی بار دیکھا تھا اور پہچانا تھا اور تجھے میرے خیمے میں لایا ہے؟

حاتم طائی نہایت لاپروائی اور بغیر کسی خوف وہراس کے اس بھیڑ میں گھس گیا۔ اس نے ہر ایک کا چہرہ دیکھا اور پھر ایک دم ایک لکڑہارے اور اس کی بیوی پر اس کی نگاہ پڑی۔ اس نے لکڑہارے کا ہاتھ پکڑا اور اسے نوفل کے سامنے پیش

کردیا اور کہا: نوفل بن ہامان! اگر تو حقیقت جاننا چاہتا ہے تو سمجھ لے کہ یہ وہ بوڑھا لکڑہارا ہے جس نے سب سے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک غار میں ڈھونڈا ہے۔ ہم اس کی بیوی کے ساتھ یہاں آرہے تھے کہ کچھ لوگوں نے ہمارا راستہ روک لیا اور مجھے اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔

جب بوڑھے لکڑہارے نے حاتم کی زبان سے یہ سب سنا، وہ زار و قطار رونے لگا اور حاتم طائی کے پیروں پر گر پڑا۔ نوفل بن ہامان یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ بوڑھے لکڑہارے پر چیخا اور کہا: اب یہ وقت حاتم طائی سے عذر چاہنے اور معذرت طلب کرنے کا نہیں۔ تو خود چاہتا تھا کہ اسے میرے حضور پیش کرے اور یہی کام تو نے انجام بھی دیا ہے۔ اب آ، اور جلدی سے یہ سو دینار اٹھا اور یہاں سے چلتا بن اس لیے کہ مجھے اس وقت سب سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔

بوڑھا شخص اپنی جگہ سے اٹھا۔ نوفل بن ہامان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا اور کہا: اے نوفل! میں حاتم طائی سے عذرخواہی کی خاطر آنسو نہیں بہا رہا ہوں۔ اگر تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے خود کو اس کے سامنے اس طرح خوار و ذلیل کرلیا ہے، تو اس کی وجہ حاتم طائی کی درگذر کرنے اور جوانمردی کی خصلت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ نوفل نے بوڑھے لکڑہارے سے چپ رہنے کو کہا اور بولا: بہت اچھے! اب جلدی سے یہ بتا کہ تو نے حاتم طائی کو کس طرح اور کہاں دیکھا تھا۔ اور تو اس کی کونسی درگذر کرنے اور جوانمردی کی خصلت کی بات کر رہا ہے؟

بوڑھے شخص کو محسوس ہوا کہ اب اسے نوفل بن ہامان سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس نے صبر اور حوصلے سے اول سے آخر تک وہ سب واقعات جو ایک دن پہلے رونما ہوئے تھے، نقل کردیے۔ نوفل نے یہ سب ماجرا سنا ایک لمحے کے لیے پتھر

کے ایک بت کی طرح اس نے بوڑھے شخص اور حاتم طائی کو سر سے پیر تک دیکھا۔ان باتوں نے اس کے پتھر جیسے دل کو نرم کردیا۔جس کی وجہ سے حالات بالکل بدل گئے۔اس وجہ سے وہ ایک دم اس جگہ سے جہاں وہ غرور وتکبر کے ساتھ بیٹھا تھا، اٹھا اور ایک غلام کی طرح زمین پر گر پڑا۔اس نے حاتم طائی کے ہاتھ پیر چومے اور کہا: اے حاتم طائی! مجھے معاف کردے۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ میں نے کس شخص سے دشمنی اور کینے کا راستہ اختیار کیا ہے۔اگر میں یہ قصد کروں کے تجھے زمین پر دے پٹخوں، لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟ آیا وہ مجھ سے یہ نہیں کہیں گے کہ حاتم طائی کون تھا جس کے ساتھ تو نے دشمنی کی اور اس کی وجہ سے دوسروں کی نظر میں خود کو ذلیل وخوار کرلیا؟

نوفل بن ہامان حاتم طائی کی درگذشت کرنے اور جوانمردی کی خصلت سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اس لیے اس نے نہ صرف حاتم طائی سے دشمنی کا راستہ ترک کردیا بلکہ اس کے خادموں کی صف میں شامل ہوگیا۔

☆☆☆

شیر اور بلی

برسوں پہلے، قدیم زمانے میں، دور ایک جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ اپنی طاقت اور ہیبت کے لحاظ سے کوئی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت سے پرندوں، رینگنے والوں اور درندوں پر حکومت کرتا تھا۔

ایک بار..... یہ شیر جب تک بازوؤں کی طاقت کا حامل تھا اور اس کے چنگھاڑنے کی زوردار آواز جنگل کو لرزا دیتی تھی، بہت سے جرأت نہیں کرتے تھے حتی کہ اس کی طرف نظر بھی اٹھا کر دیکھیں، لیکن آہستہ آہستہ اس کی زندگی کے دن اور سال گذرتے گئے اور وہ اپنی پہلی جیسی قوت وطاقت سے محروم ہوگیا۔ اس وجہ سے دوسرے جانور اس کی وہ قدر نہیں کرتے تھے جو کرنی چاہیے تھی، وہ تو اب خود اس کے سامنے اس پر سبقت لے جاتے تھے۔

ایسے جانوروں کے گروہ میں ایک چوہا تھا۔ وہ چوہے جو ابھی کل تک اس کے سامنے سے خوفزدہ اور لرزتے ہوئے گذرتے تھے، اب اس بے نوا کا کچھ لحاظ بھی نہیں کرتے تھے، اس کے منہ آنے لگے وہ کبھی اس کی دم کھینچتے۔ اور کبھی اس کے کان پر کاٹتے۔ اس حالت میں بیچارہ شیر بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنا خون پیتا رہتا اور کوئی آواز بھی نہ نکالتا تھا۔

یہ تھے حالات کہ ایک بھیڑیا اس کی تلاش میں آیا تا کہ اس کی خیر و عافیت معلوم کرے۔ حضرت بھیڑیے کی شیر سے پرانی دوستی اور رفاقت تھی۔ جب بھی موقع ملتا وہ شیر سے ملنے آتا تھا یہ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کہتے سنتے تھے۔ ایک روز جب بھیڑیا شیر کی تلاش میں آیا، شیر نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور چوہوں کی کارستانیوں کا قصہ سنا دیا۔ بھیڑیے نے شیر کی باتیں سننے کے بعد کہا:

میرے سردار! آپ کے حالات تو بغداد کے اس خلیفہ کی حکایت کے مانند ہیں۔

شیر نے پوچھا: کونسی حکایت؟

بھیڑے نے کہا:

برسوں پہلے بغداد میں ایک خلیفہ تھا۔ ایک عظیم قلمرو اس کے زیر حکومت تھی، لیکن یہی خلیفہ مٹھی بھر مکھیوں کے گروہ سے اذیت و پریشانی کا شکار تھا۔ اس کے رات دن ان مکھیوں کو اپنے محل سے بھگانے میں گذرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ایک دن خلیفہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اس نے اپنے مشاورین میں سے دو کو بلایا جو عقل وخرد میں سب سے آگے تھے۔ اس نے اپنی لاچارگی کا اظہار کیا: میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان مکھیوں کی خلقت کا راز کیا ہے؟

پہلے مشاور نے کہا: حضور والا! اس مخلوق کا ایک بڑا فائدہ ہے، اس وجہ سے کہ یہ لوگوں کو ہوشیار کرنے کا باعث ہوتی ہیں اور دوسرے یہ کہ کوئی یہ نہیں سوچے کہ وہ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مثلاً خلیفہ جو ایک عظیم قلمرو پر حکومت کرتا ہے، چھوٹی چھوٹی چند مکھیوں کے مقابلے میں عاجز و ناتوان ہے۔

خلیفہ نے سر ہلایا اور بولا: تیری باتوں سے میں کچھ سمجھا نہیں۔

اس نے اپنے دوسرے مشاور سے اپنا خیال پیش کرنے کا حکم دیا کہ مکھیوں

کا فائدہ کیا ہے؟

دوسرے مشاور نے کہا: حضرت والا! مکھیوں کا فائدہ یہ ہے کہ مکھیاں طاقتوروں کو اس طرف متوجہ کرتی ہیں کہ کمزور لوگ اگر ہاتھ ملالیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں، وہ طاقتوروں کو زیر کر سکتے ہیں۔ لیکن مکھیوں پر فتح حاصل کرنا، عقل سلیم بھی چاہتی ہے اور تدبیر بھی، بالآخر ہر رنج وغم کے مقابلے میں خوشی بھی ہے شادمانی بھی۔ اب شیر نے پوچھا اچھا: اب بتاؤ کہ چارۂ کار کیا ہے؟ میں ان چوہوں کے شر سے کیسے نجات حاصل کر سکتا ہوں؟ تمہارے خیال میں مجھے کیا تدبیر کرنی چاہیے؟

بھیڑیا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا: حضرت! ہمیں بلی کی تلاش کرنی چاہیے۔ یہ کام صرف بلی ہی انجام دے سکتی ہے۔

شیر کچھ پریشان ہوا اور کہا: تجھے معلوم بھی ہے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ آخر عمر میں چاہتا ہے کہ مجھے بلی کا دامن پکڑنے پر آمادہ کرے؟

بھیڑیے نے کہا: اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ چوہوں کے ہاتھوں تجھے اذیت و تکلیف نہ پہنچے تو پھر تجھے بلی یہاں لانی ہوگی۔

شیر نے بھی کوئی اور چارہ نہیں دیکھا۔ اس نے بادل ناخواستہ اور مرضی کے بغیر کہا کہ بلی کو اطلاع دو۔ جلد ہی ایک بلی شیر کے حضور میں پہنچ گئی۔ اس کا سارا جسم خوف سے تھرّا رہا تھا۔ شیر نے اس کی ہمت بندھائی اور کہا: لازمی نہیں کہ تو ڈرتی رہے۔ مجھے تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک زمانے سے چند چوہوں نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ وہ ایک گھونٹ پانی بھی آرام سے میرے حلق کے نیچے نہیں اترنے دیتے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح ہو سکے چوہوں کے ہاتھوں مجھے پہنچنے والی اذیت و تکلیف کا رخ خود ان کی

طرف موڑ دے۔

بلی نے جو یہ بات سنی تو اس کے دل کو تقویت ہوئی۔ اس کے جسم کی تھر تھراہٹ ختم ہوئی۔ پھر اس نے کہا: حضرت شیر! میں یہ کام انجام دوں گی، لیکن چوہوں کی مصیبت کو کم کرنے کی ایک شرط ہے۔ شیر نے بھیڑیے کی طرف دیکھا اور کہا: دیکھا، دوبارہ کیا اکڑ کے بات کر رہی ہے۔ یہ وہی بلی ہے۔ جس کی مجھے دیکھ کر جان نکلتی تھی، بھیڑیے نے کہا: میرے سردار! اب کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ بہر حال آپ کا آج کا کام تو اسی بلی کے عزم و ہمت پر منحصر ہے چوہوں کے شر سے نجات کے لیے بلی کی شرط منظور کر لیجیے۔

شیر نے بڑی بے رخی سے جواب دیا: اچھا، بتا تیری شرط کیا ہے؟ لیکن ایسی شرط رکھنا کہ میں اسے پورا کر سکوں۔

بلی نے کہا: برسوں پہلے میرے آبا و اجداد میں شیر کی سی طاقت و عظمت تھی۔ ایسی کہ بلّی سے تمام حیوانات خوف کھاتے تھے۔ لیکن آج اس قوت و عظمت کی کوئی خیر خبر نہیں۔ میری شرط یہ ہے کہ ہم بلیوں کی گذشتہ قوت و عظمت لوٹ آئے۔ میں یہاں شیر کے ساتھ تمام نعمتوں سے بہرہ یاب ہوں۔

شیر نے سر ہلایا اور بولا: اچھا ٹھیک ہے مجھے معلوم تھا کہ تو مجھ سے کوئی بڑی چیز مانگے گی، لیکن اب کوئی چارہ بھی تو نہیں، تو چوہوں کی مصیبت کم کر، اس کے بدلے میں، مجھے جو کچھ نصیب ہوگا، تو بھی اس میں حصہ دار ہوگی۔

ابھی شیر اور بلی کی گومگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ چوہوں کا ایک گروہ، ناچتا اور خوشی مناتا وہاں پہنچ گیا اور شیر کے چاروں طرف اچھل کود میں مشغول ہوگیا۔ اس کے سر اور پیروں پر چڑھنے لگا۔ شیر نے گذشتہ دنوں کی طرح، کچھ دیر ان کی یہ گستاخی برداشت کی اور خاموش رہا۔ لیکن ایک دم اس نے سر ہلایا اور بلی کو

آواز دی۔ بدقسمتی سایہ نہ ڈالے، بلی جہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں سے چوہوں پر کودی۔ چوہوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہاں بلی کی شکل صورت بھی نمودار ہوسکتی ہے۔ وہ خوف و ہراس سے چیخے اور شیر کے آس پاس سے منتشر ہوگئے۔ ان میں سے ہر ایک کسی سوراخ میں گھس گیا۔

شیر نے اب ایک مدت بعد آرام کا سانس لیا۔ بلی کی اس حرکت سے خوش ہوا۔ اس کو پیار کیا اور بلی کو شیر کی نگاہ میں ایک بلند و بالا مقام حاصل ہوگیا۔

اس دن کے بعد، بلی کی حیثیت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ ہر روز شیر کے اطراف میں نگہبانی کرتی اور جیسے ہی دور سے بھی کسی چوہے کو دیکھتی اسے اپنے دانت اور پنجے دکھاتی، چوہے بھی بھاگ جاتے اور اپنا کام کرتے۔ بلی کی اس خدمت کا صلہ یہ تھا کہ جب بھی شیر کے لیے شکار کا گوشت لایا جاتا، وہ شیر کے قریب بیٹھ جاتی اور اس کے ساتھ کھانے لگتی۔ اس نے اب اپنی حیثیت یہ بنالی تھی کہ کبھی کبھی خود شیر کے پنجے سے گوشت کا ٹکڑا چھین لیتی اور کھالیتی، شیر کو اس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا، وہ بلی کی اس قسم کی حرکتوں سے افسردہ اور کبھی غصے ہوتا، لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ وہ ہر حال میں بلی کے رویے کو چپ چاپ برداشت کررہا تھا۔

دن رات اسی طور پر بلی کی آرزوؤں کے مطابق گذرتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑھاپے کی وجہ سے بلی بیمار ہوگئی۔ اس بیماری نے اسے جلد ہی بے کار بنادیا۔ وہ اب شیر کے لیے کوئی کام نہیں کرسکتی تھی۔ اس صورت حال میں، اس نے چوں کہ شیر سے وعدہ کیا تھا کہ چوہوں کو اس سے دور کیا کرے گی اور اس کی روزی روٹی کا انحصار بھی اسی کام پر تھا، اس نے ایک جوان لڑکے کو آواز دی اور اس سے کہا: سالوں سال سے میں شیر کی خدمت میں ہوں اور مردم آزار چوہوں

کو اس بیچارے کے پاس پھٹکنے تک نہیں دیا ہے، یہی وجہ تھی کہ میں نے شیر کی نگاہوں میں آبرومند جگہ بنالی تھی۔ اس دوران میں اور تو بھی کھانا پینا حاصل کرتے رہے۔ لیکن اب میں اس حال کو پہنچ گئی ہوں کہ یہ کام نہیں کرسکتی اس لیے تجھے بلیوں کی آبرو بچانے کی خاطر شیر کی خدمت کرنی چاہیے اور چوہوں کو اس بیچارے کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

جوان بلے نے سر اور کان ہلائے اور کہا: ٹھیک ہے بزرگ! مجھے صرف شیر کی خدمت میں پہنچنے دو، میں کام کروں گا، اور چوہوں کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آنے والے دنوں میں اس کے قصے بیان کیے جایا کریں گے۔

بلی خوش ہوئی اور اپنے جوان لڑکے کی تعریف وتوصیف کی۔ اس سے یہ بھی کہا کہ وہ صرف باتیں نہ بنائے، جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرے۔

جوان بلے نے یہ قول وقرار کیا اور اپنی راہ لی۔ شیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیر نے پوچھا، ارے بلّے! تیرا باپ کہاں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے کام سے اور ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے؟

جوان بلّا بولا: نہیں جناب ایسا نہیں ہے: وہ چاہتا ہے کے کچھ مدت آرام کرلے۔ جب تک وہ نہیں ہے، میں آپ کی خدمت میں رہوں گا اور چوہوں سے نپٹتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام کامیابی سے انجام دوں گا اور بلیوں کے خاندان کی عزت وآبرو کی حفاظت کرسکوں گا۔

شیر کو جوان بلّے کی باتیں پسند آئیں۔ اس نے بلّے کو شاباشی دی، ابھی کچھ لمحے ہی گزرے تھے کہ چند چوہے نظر آئے انہوں نے جو بوڑھے بلّے کی جگہ خالی دیکھی تو اس بار بہت زیادہ شور شرابے اور ہا، ہو کے ساتھ شیر کے سر اور پیروں پر چڑھنا شروع کردیا۔ اور یہاں تک کہ جوان بلّے کا مذاق بھی اڑایا۔ جوان بلّے کو

چوہوں کی اس حرکت پر غصہ آیا، وہ چیخا۔ پل بھر میں اپنی جگہ سے اچھلا اور بجلی کی سی تیزی سے چوہوں کی طرف جھپٹا۔ایک ہی لمحے میں اس نے دو تین وحشت زدہ چوہوں کو اچھلتے کودتے میں پکڑلیا اور اپنے پنجوں سے ان کا کام تمام کردیا۔ شیر نے جو اس جوان بلّے کی جرأت دیکھی ،اس نے حکم دیا کہ نئے آنے والے بلّے کی اس روز کی اجرت دگنی کردی جائے۔

رات کو جب بلّا اپنے گھر لوٹا اور بتایا کہ شیر نے اس کی تعریف کی ہے،تو اس کا باپ خوش ہوا اور جوان بلّے سے کہا کہ وہ اس تعریف وتوصیف سے مغرور نہ ہو۔ ہر روز اپنا کام بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دے۔

اس کے دوسرے دن ، جوان بلّا پھر شیر کی خدمت میں پہنچا۔شیر نے جیسے ہی اسے دیکھا،خوش ہوا اور کہا: مجھے امید ہے کہ آج بھی تو کچھ چوہوں کی طبیعت صاف کردے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے ایسا کیا تو میں تجھے اس کا اچھا بدلہ دوں گا۔

جوان بلّا اپنے ساتھ شیر کے اس رویے کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ بڑے غرور و تکبر کے ساتھ شیر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ شیر کے کچھار کے گوشے و کنار پر نظر رکھی۔ اور منتظر رہا کہ چوہے کب وہاں آتے ہیں۔ کچھ دیر اسی طرح گذر گئی یہاں تک کہ چند چوہے وہاں نکل آئے۔ چوہے اس بار ناچ گا نہیں رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بار ان کا ارادہ یہ ہے کہ وہ شیر اور اس بلّے سے جو اس کی نگہبانی کر رہا تھا، انتقام لیں۔ اس خیال سے چوہوں نے اچانک چھلانگ لگائی اور ایک ہی دفعہ شیر کے سر اور چہرے پر حملہ بول دیا۔بعض چوہوں نے شیر کی دم اور سر پر اس قدر زیادہ کاٹا کہ شیر ایک درد بھری آواز میں غرّایا۔ اپنی جگہ سے اچھلا۔ جوان بلّے نے جو یہ دیکھا تو اس کی رگ غیرت بھڑکی۔ اس کو بھی جوش

آ گیا۔ وہ بھی چیخا اور چند چوہوں کا پھر سے کام تمام کردیا اور دوسروں کو فرار کرنے پر مجبور کردیا۔ شیر نے اس بار بھی جوان بلّے کی کمر تھپتھپائی۔ اس کے دوسرے اور تیسرے دن چوہوں کی نسل کا شیر کے کچھار میں آنا جانا منقطع رہا۔

گذشتہ روز جب چوہوں اور بلّے کی جنگ ختم ہوئی تھی، جوان بلّے نے خود سے کہا تھا: آج مجھے اپنے باپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اس نے شیر کے حق میں کوتاہی کیوں کی تھی؟ یہ بلیوں کی زندگی کی رسم تو نہیں۔ جب میں نے آرام سے چند روز ہی میں چوہوں کو بھگادیا، میرے والد نے چند سال میں یہ کام کیوں نہیں انجام دیا اور جس کی وجہ سے مردم آزار چوہے اس طرح چاق وچوبند ہوگئے۔

پھر اس نے خود سے کہا: اچھا اگر میرا باپ ناراض ہوا اور پھر اگر وہ یہ کہے کہ مجھ میں اس کی سکت نہیں تھی، تو میں کیا جواب دوں گا؟

جوان بلّے نے یہ سب سوچا اور پلان بنایا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ جو بھی کچھ پیش آئے، وہ یہ سوال باپ سے پوچھے گا ضرور اس لیے کہ اسے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ان چند برسوں میں چوہے اُس جیسے دلاور بلّے سے فرار ہونے میں کیسے کامیاب ہوتے رہے۔

جوان بلّا، شیر سے جو کچھ انعام ملا تھا، اس کے ساتھ خوشی خوشی اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس کا باپ اسے دیکھ کر پھر خوش ہوا اور اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لیے اپنی دم ہلائی اور کہا: آج بھی بھرے ہاتھوں لوٹا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیر تجھ سے بہت راضی اور مطمئن ہیں۔

جوان بلّا غبغب کچھ بولا اور کہا: اسے مجھ سے راضی ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے کہ میں نے اس کے لیے ایسا کام کیا ہے کہ کسی دوسرے نے اس کے لیے اب تک کم ہی ایسا کیا ہے۔

اس کی ان باتوں سے بوڑھا بلا سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا: آخر تو نے شیر کے لیے ایسا کیا کام انجام دیا ہے؟

جوان بلا کچھ دیر کے لیے خاموش رہا اور پھر بولا: والد صاحب! میں نے شیر کی وہ خدمت انجام دی ہے اور اس کے لیے وہ زحمت اٹھائی ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں تو بھی ایسا نہیں کر سکا۔

بوڑھا بلا اور بھی زیادہ حیرت میں پڑ گیا اور پوچھا: تجھے معلوم بھی ہے کہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو نے تو اتنے جلدی اپنی حیثیت کو بھلا دیا۔ تو یہ بھول گیا کہ میں نے ہی جنگل کے بادشاہ کے گھر کا راستہ تجھے دکھایا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا، تجھے کون وہاں تک پہنچاتا۔

جوان بلا بولا: میں یہ نہیں کہہ رہا، بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان چند برسوں میں چوہے کیسے چاق و چوبند ہو گئے ہیں؟ میرے والد کی طرح ایک بہادر بلا اس مدت میں ان چوہوں کا دماغ ٹھکانے نہیں لگا سکا جو جنگل کے بادشاہ کے لیے باعث اذیت ہیں۔

بوڑھا بلا بولا: کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ میں ان چوہوں سے ڈرتا تھا؟

جوان بلّے نے پوچھا: اگر ڈرتا نہیں تھا تو پھر ان کا کام تمام کیوں نہیں کیا؟

بوڑھا بلا اپنے لڑکے کی ان باتوں پر حیرت زدہ رہ گیا اور افسردہ بھی ہوا۔ اس نے پوچھا: تو مجھے بتا کہ ان چند دنوں میں تو نے کیا کام انجام دیا ہے کہ اس قدر مغرور ہو گیا ہے؟

جوان بلا بولا: میں نے چوہوں کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہے میں نے وہ کام کیا ہے کہ سالوں سال اب کوئی بھی چوہا شیر کی قلمرو کے قریب بھی پھٹکنے کی جرأت نہیں کر سکتا والد صاحب! میں نے ان تمام چوہوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔

بوڑھے بلے نے یہاں تک اس کی باتیں سنیں اور کہا: کیا تو صحیح کہہ رہا ہے؟ بس یہی بات تھی کہ شیر نے تیرے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا۔ اچھا تو قصہ یہ تھا،

جوان بلا بولا، تو نے دیکھا میں نے وہ کام کیا ہے کہ ان چند برسوں میں تجھ سے بھی نہیں ہوسکا۔

بوڑھے بلّے نے بالکل بھی دیر نہیں کی۔ وہ فوراً چل پڑا اور کہا: مجھے ابھی فوراً جنگل کے بادشاہ کے پاس جانا ہوگا۔

جوان بلا بولا: ٹھیک ہے جایئے۔ اگر تجھے اعتبار نہیں ہے، ہم شیر کی خدمت میں جاتے ہیں تا کہ تو خود اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھ سکے۔ یہ طے کرنے کے بعد، دونوں بلے چل پڑے اور شیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بوڑھا بلا آگے بڑھا۔ شیر کی تعظیم کی اور کہا: اے عظیم بادشاہ! میں نے سنا ہے کہ ان چند دنوں میں تو میرے فرزند رشید سے بہت راضی اور خوش رہا ہے اور اسی خاطر تو نے اس کی بارہا تعریف بھی کی ہے، اسے صلہ بھی دیا ہے۔ میں حاضر ہوا ہوں کہ اپنے اکلوتے لڑکے کے حق میں تیری محبتوں اور الطاف کا شکریہ ادا کروں۔

شیر نے بلّے سے بڑی سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر اپنے اردگرد دیکھا اور کہا: ٹھیک ہے، کچھ اور کہنا ہے؟

بوڑھا بلا بولا: میں حاضر ہوا ہوں کہ اب پھر پہلے کی طرح آپ کی خدمت کروں، لیکن اس بار میں تنہا نہیں ہوں، اس بار میرا دلیر لڑکا بھی میرے ساتھ ہے۔

شیر نے جب یہ سنا، قہقہہ مارا اور کہا: آیا ہے خدمت کرنے؟ لازمی طور پر اس لئے کہ چوہوں کو مارے، انہیں برباد کرے؟ اگر یہاں کوئی چوہا ہے، تو خدمت کے لئے آمادہ رہ۔

دونوں بلیوں نے اپنے ہاتھ پیروں سے لمبی دم اپنے کولہوں پر رکھی اور شیر

کے پاس سے چلے گئے۔ راستے میں بوڑھے بلے نے جوان بلے کی طرف دیکھا اور کہا: اب بھی تو کیا یہ سوچتا ہے کہ تو نے بڑا اہم کام کیا اور چوہوں کو تہس نہس کر دیا؟ ارے نادان! تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تیرا باپ اس قدر کمزور اور ناتواں ہے کہ اس قدر سادہ اور آسان کام اس سے ممکن نہیں؟ میں بھی پہلے ہی دن چشم زدن میں سب چوہوں کا قلع قمع کر سکتا تھا۔ لیکن ایک وجہ تھی کہ انہیں صرف دھمکاتا تھا اور بادشاہ کے قریب سے انہیں دور کر دیتا تھا..... اب آؤ یہاں قریب ہی میں دیکھ بھال کریں، اور اگر ہو سکے کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈیں۔

اور اس طرح، بلّے اپنا کھانا پینا تلاش کرنے، اِدھر اُدھر سرگرداں ہو گئے۔

☆☆☆

پروفیسر ذاکرہ شریف قاسمی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں فارسی کی استاد ہیں۔ دہلی کی رہنے والی ہیں اور اسی تاریخی اور قدیم شہر میں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ دہلی کالج (آج کے ذاکر حسین کالج) دہلی یونیورسٹی سے آپ نے فارسی میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں اول رہیں۔ اسی کالج سے فارسی میں ایم۔اے کیا اور دہلی یونیورسٹی ہی سے آپ نے بی۔لب اور پھر Ph. D. کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ کی Ph. D. مقالے کا عنوان تھا ''فارسی ادب بہ عہد شاہجہان'' آپ ۱۹۷۷ء سے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں فارسی کی استاد ہیں اور سینیر استاد۔ کئی طلبا آپ کی رہنمائی میں ایم فل اور ڈاکٹریٹ بھی کر چکے ہیں۔ اس سے قبل آپ ''فارسی شاعری: ایک مطالعہ'' اور ایک ایرانی سفرنامہ ''زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار'' شائع کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے متعدد مقالات وقیع رسائل اور دانشنامۂ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے ہندستان اور ایران میں چند علمی و ادبی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور مقالات پیش کئے ہیں۔